جلد 9، شمارہ 2,3
مئی تا دسمبر، 2016

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا!

پاکستان کی بڑی آبادی مزدور طبقے پر مشتمل ہے جو اپنے کاندھوں پر ملک کے تمام پیداواری شعبہ جات، چاہے وہ زرعی ہوں، صنعتی ہوں یا خدمت کے شعبے سے جڑے ہوں، کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ خوراک کی پیداوار پر نظر دوڑائیں یا اہم ترین نقدآور کپاس و گنے کی فصلوں پر، اس طبقے کی محنت کے ہی مرہون منت ہے۔ معاشی پیداوار میں مزدور عورت کے کردار کو پرکھیں تو چاہے گندم کی کٹائی ہو یا کپاس کی چنائی، مزدور عورت کے بغیر ممکن نہیں! ملک کو پیداوار کے ذریعے دولت کما کر دینے والے مرد و عورت مزدور، چاہے وہ دیہی یا شہری آبادی سے ہوں، ان کی معاشی و معاشرتی صورت حال بھیانک ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کل مزدور آبادی کا کم از کم 75 فیصد حصہ غیر رسمی شعبے سے تعلق رکھتا ہے اور قانوناً اپنے مزدور حقوق سے محروم ہے۔ مزدور کو نہ ہی کوئی چھٹی کا دن میسر ہے اور نہ ہی وہ علاج معالجہ، پینشن یا دیگر سہولیات تک رسائی کے لیے سرکار سے کسی قسم کی امید رکھ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس غیر رسمی شعبہ میں عورت مزدور سب سے زیادہ پستی میں ہے کیونکہ وہ نہ صرف کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ محنت کرنے پر مجبور ہوتی ہے بلکہ زبانی، جسمانی اور جنسی تشدد کا بھی شکار ہے۔ پاکستان میں مزدوروں کی سب سے بڑی حق تلفی خصوصاً زرعی مزدور کو رسمی شعبے میں شامل نہ کرنا ہے۔

خود مختاری پر مبنی صنعتی ترقی کو نظر انداز کر کے غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے ملک میں بڑے پیمانے پر جگہ بنائی جارہی ہے۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پیک) اس کی ایک مثال ہے۔ بڑے بڑے منصوبوں کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے میں دیر نہیں لگتی پر محبِّ وطن محنت کش عوام کو آئینی حقوق دینے کے لیے سرکار بے بس و لاچار نظر آتی ہے۔ سی پیک کے علاوہ بھی کئی ''ترقیاتی'' منصوبے جاری ہیں جن میں جدید ٹیکنالوجی پر مبنی جینیاتی اور ہائبرڈ بیج کا فروغ شامل ہے۔ بیج کے نئے قوانین کے ذریعے کسان سے اس کے صدیوں پرانے بیج پر مشترکہ حقوق کو چھین لیا گیا ہے اور بیج جو بنیادی ذریعہ خوراک اور اہم قدرتی وسائل کو پیدا کرنے کی اکائی ہے، کو غیر ملکی منافع خور کمپنیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

بیروزگاری، بھوک اور غربت سے بلکتی قوم کے لیے ایسے ایسے منصوبے ملکی مفاد کے نام پر پیش کیے گئے ہیں کہ عوام دنگ ہیں کہ اس سے زیادہ ظالم حکمران شاید ہی کسی ملک کو نصیب ہو مثلاً عوام اور کسان سے زمین زبردستی چھینی جارہی ہے۔ ملک میں خراب ہوتی ضرورت سے زائد گندم عوام و کسان کو فراہم کرنے کے بجائے تاجر طبقے کو مراعات دے کر بیرون ملک بیچنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ غیر ملکی غذائی اشیاء مثلاً زنک وغیرہ کا کاروبار کرنے والی دیوہیکل کمپنیوں کی ایما پر درآمدی ٹیکس کم کر کے پاکستان میں اگائے گئے اجناس مثلاً گندم میں اضافی غذائیت (fortification) متعارف کروائی جارہی ہے۔ کھاد پیدا کرنے والی صنعت کو مراعات فراہم کی جارہی ہے۔ اس ظلم پر عوام و کسان احتجاج کرتے ہیں تو ان پر لاٹھیوں کی بارش غرض ہر طرح کا جبر کر کے مزید ظلم کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔

یقیناً یہ عوام، کسان، مزدور دشمن پالیسیاں اسی لیے ممکن ہیں کے ہمارے حکمران ان خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے نسل درنسل انگریز اور عالمی اشرافیہ کی غلامی قبول کرتے ہوئے عوام کو غربت اور بھوک کی دلدل میں جھونک دیا ہے۔ اگر عوام کو آسودہ روزگار اور تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا تو یقیناً یہ ناممکن تھا کہ وہ دور جہالت کے رسم و رواج قبول کرتے ہوئے ظلم و جبر کی چکی میں پستے رہتے۔ ظلم و استحصال کی ان زنجیروں سے آزادی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ عوام متحد ہوکر پیداواری وسائل پر اپنے حق کے لیے جدوجہد کا راستہ اختیار کرے!

فہرست مضامین

چین پاکستان اقتصادی راہداری اور گلگت بلتستان.... 2
زرعی مداخل پر حکومتی مراعات، کس کے لیے؟..... 10
گندم، زرتلافی اور غذائی کمی..... 13
بی ٹی کپاس کی پیداوار: ایک سراب..... 18
گھریلو کام کرنے والی مزدور عورت. 21
زمیندار خدا!..... 27
بات تو سچ ہے مگر..... 34
رخ زمانہ..... 38

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
بلاگ: rootsforequity.noblogs.org

چین پاکستان اقتصادی راہداری اور گلگت بلتستان

تحریر: فدا حسین

تعارف

گلگت بلتستان پاکستان کا حصہ ہے اور عمومی طور پر شمالی علاقہ جات کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ یہ پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ گلگت بلتستان اپنی جغرافیے کی وجہ سے ایک اہم علاقہ ہے۔[1] اس کے مغرب میں خیبر پختون خوا اور شمال میں واخان کوریڈور ہے جو کہ شمال مشرقی افغانستان کا ایک تنگ خطہ ہے اور پاکستان کو تاجکستان سے الگ کرتا ہے۔[2] گلگت بلتستان کا کل رقبہ 28,174 مربع میل ہے اور اس کی آبادی 18 لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ گلگت بلتستان کا صدر مقام گلگت ہے۔[3]

ڈویژن اور اضلاع

انتظامی لحاظ سے گلگت بلتستان کو دو ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور دونوں ڈویژن دس اضلاع میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ گلگت بلتستان سات اضلاع پر مشتمل تھا لیکن پیپلز پارٹی کے دور میں تین اضلاع کا اضافہ کر دیا گیا۔ پچھلی حکومت نے ہنزہ نگر کو ایک ہی ضلع کا درجہ دیا تھا لیکن حال ہی میں موجودہ حکومت نے ہنزہ اور نگر کو الگ الگ ضلع بنا دیا ہے اور اس کے ساتھ بلتستان میں شگر کو بھی الگ ضلع کی حیثیت دی گئی ہے۔[4]

- گلگت ڈویژن کے چھ اضلاع گلگت، غذر، دیامر، استور، ہنزہ اور نگر ہیں۔
- بلتستان ڈویژن کے چار اضلاع اسکردو، گانچھے، شگر اور کھرمنگ ہیں۔

تاریخ گلگت بلتستان

گلگت بلتستان کی تاریخ کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ اس سیکشن کے لئے معلومات کئی ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں جن میں بلاگ اور ڈاکٹر احمد حسن دانی کی کتاب "تاریخ شمالی علاقہ جات پاکستان" بھی شامل ہے۔

زمانہ قبل از مسیح: (Pre-History 5th Milennium BC) گلگت بلتستان کے قدیم باشندوں کی تاریخ پانچویں صدی قبل از مسیح سے ملتی ہے۔ یہ باشندے روک آرٹ پیپل (Rock Art People) کے نام سے جانے جاتے تھے، یہ شکار پر گزارا کرتے اور غاروں میں رہائش پزیر تھے۔ ان کے مذہب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہاڑوں کو پوجتے تھے۔

میگالتھ بلڈرز: (Megalith Builders) یہ لوگ سوات اور چترال سے آئے تھے اور عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ یہ لوگ مختلف دھاتوں تانبہ، سونا، چاندی اور کانسی کا استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے کاشتکاری شروع کی اور مال مویشی جیسے بکری اور بھیڑ وغیرہ بھی پالتے تھے۔ میگالتھ کچے مکانات بناتے تھے اوران میں عارضی طور پر رہائش اختیار کرتے تھے۔

ڈارڈک لوگ: (Dardic People 4th Century BC) کچھ تاریخ دانوں کے مطابق یہ لوگ اکمینین سلطنت (Achaemenian Empire) کے دور میں موجودہ گلگت بلتستان میں رہائش پزیر تھے۔ یہ لوگ سونے کی تجارت اور کان کنی کے شعبے سے وابستہ تھے۔ وسطی ایشیا اور چین کے لیے تجارتی راستے کا سبب بھی ڈارڈک ہی بنے۔

اسکائی تھو پارتھینز: (Scytho Parthians 1BC and 1AD) گلگت بلتستان کے بعض علاقوں بشمول چلاس کے علاقے میں چٹانوں سے ملے کتبات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے وسطی ایشیا سے یہاں آکر اپنی حکمرانی قائم کیا اور ٹیکسلا سے تجارتی تعلقات قائم کیے۔

کشانز: (The Kushans 1BC and 1AD) کشانز نے جو پہلے ہی وسطی ایشیا اور چین میں اپنی سلطنت قائم کر چکے تھے ایک صدی قبل از مسیح اور ایک صدی بعد از مسیح کے درمیان اس علاقے کا رخ کیا اور اپنی سلطنت قائم کی۔

ساسانی: (Sassanis 3rd Century AD) ساسانی قوم نے تیسری صدی میں اس علاقے پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا۔ ان کے دور میں یہاں بدھ مت مذہب کی ترویج ہوئی اور یہ علاقہ ہندوستان سے چین اور وسطی ایشیا تک سفر کے لیے ایک مشہور مقام بن گیا۔

ہنز: (The Huns) یہ وسطی ایشیا کے جنگجو قبائل تھے۔ انھوں نے بھی اس سرزمین پر شینا اور بروشسکی بادشاہوں کے ذریعے حکومت کی جنھیں راجا کہا جاتا تھا۔[5]

وسطی اور جدید تاریخ:(Medieval to Modern Times)

ہنز کے زوال کے بعد مقامی راجہ خود مختار ہوگئے۔ سنہ 750-612 تک پٹو ول شاہی خاندان جو کہ بدھ مت تھے، نے یہاں پر حکومت کی جن کے چین کی سلطنت سے قریبی مراسم تھے۔ ساتویں صدی سے 19 ویں صدی کے شروع تک گلگت بلتستان میں مختلف خاندانوں نے مختلف علاقوں میں حکومت کی جن مین گلگت کے ترکھان، نگر کے مگلوٹر، ہنزہ کے ایاشو، پونیال کے برشائی، اسکردو کے مقپون، شگر کے آنچنز اور خپلو کے یبگوز شامل ہیں۔آٹھو ویں صدی میں قوم ترکھان نے اسلام قبول کیا۔ 19 ویں صدی کے اوآخر میں انگریزوں نے گلگت کو ایک ایجنسی بنایا اور ایک پولیٹیکل ایجنٹ نامزد کیا لیکن انگریز حکومت نے کشمیر کو مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھوں 75 لاکھ میں بیچ دیا۔ اس وقت گلگت بلتستان کا علاقہ کشمیر کی ایک ریاست تھی۔ 1947 تک یہ علاقہ ڈوگرہ راج کے زیر نگیں رہا اور یکم نومبر، 1947 کو مقامی لوگوں نے ڈوگرہ راج کا خاتمہ کردیا اور پاکستان سے الحاق کرلیا۔

گلگت بلتستان یکم نومبر، 1947 کو آزاد ہوا۔ تاریخی طور پر گلگت بلتستان کا علاقہ تین ریاستوں پر مشتمل تھا یعنی ہنزہ، گلگت اوربلتستان۔ 1848 تک میں ڈوگرہ سکھ راجہ نے ان علاقوں پر بزورطاقت قبضہ کیا تھا اور اس طرح آزادی سے پہلے تک گلگت بلتستان میں ڈوگرہ راج تھا جس میں گلگت بلتستان کا خطہ ریاست جموں و کشمیر کی ایک ریاست تھی۔ اس وقت برگیڈیئر گنسارا سنگھ جو کہ ڈوگرہ راج کے گورنر تھے اس خطے میں حکومت کررہے تھے۔ نومبر 1947 میں کرنل مرزا حسن خان جو کہ کشمیر انفنٹری کے کمپنی کمانڈر تھے، نے گلگت اسکاوٹ کے جوانوں کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ گلگت سکاوٹ کے جوانوں نے گورنر ہاؤس کا محاصرہ کیا اور گورنر سے ہتھیار ڈال کر خود کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا ۔ اس دوران گنسارا سنگھ اور جوانوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ لڑائی کے دوران ایک گولی گلگت اسکاوٹ ہنزہ پلاٹون کے ایک جوان امیر حیات کو لگی اور وہ جان بحق ہوگئے اور آزادی گلگت بلتستان کے پہلے شہید کہلائے۔ اس کے بعد فائرنگ کا شدید تبادلہ ہوااور آخر کار گنسارا سنگھ نے ہتھیار ڈال کر خود کو اسکاوٹ کے حوالے کردیا۔ جنگ کے آخری مراحل میں جب ڈوگرہ راج کو علاقے سے بھگا دیا گیا تھا پاکستان کی حکومت مدد کے لیے آئی تھی۔ یوں 72 ہزار مربع میل کا علاقہ ایک ایسی اسکاوٹ نے آزاد کرایا جن کے پاس نہ مناسب تربیت تھی نہ مناسب ہتھیار بلکہ ڈنڈوں اور لاٹھیوں کی مدد سے انھوں نے ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔ گنسارا سنگھ کے ہتھیار ڈالنے کے بعد گلگت بلتستان کی آزادی کا اعلان کردیا گیا اور اس کا نام اسلامی جمہوریہ گلگت بلتستان رکھا گیا۔ شاہ رئیس خان کو گلگت بلتستان کا پہلا صدر نامزد کیا گیا۔ ایک انقلابی کونسل حکومت کے ساتھ کام کرنے کے لیے تشکیل دی گئی اورکرنل مرزا حسن خان جس کی خدمات نمایاں تھی انقلابی سکاوٹ کے سپریم کمانڈر بن گئے۔6

آزادی کے بعد مقامی حکمرانوں کی درخواست پر حکومت پاکستان نے ایک نائب تحصیلدار کو اپنا نمائندہ بنا کر گلگت بلتستان بھیج دیا۔ یوں گلگت بلتستان نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا جو صرف 15 دن تک ایک آزاد ریاست رہی۔ جو کہ گلگت بلتستان کے صدر شاہ رئیس خان کو محکمہ ریونیوں کے میں ملازمت دی گئی جس سے وہ خوش ہوئے اور بغیر کسی شرط کے پاکستان سے الحاق کیا جس کی سزا آج تک گلگت بلتستان کے عوام بھگت رہے ہیں۔7 گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کا تعین اب تک نہیں کیا جا سکا۔ 2009 میں حکومت پاکستان نے ایک صدارتی حکم نامے کے تحت گلگت بلتستان امپاورمنٹ اینڈ سیلف گورنمنٹ آرڈر 2009 پاس کیا جس کے تحت گلگت بلتستان کو ایک عبوری ڈھانچہ دیا گیا جو اب تک نافذالعمل ہے اور اسی دوران وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اس علاقے کا نام کو جو اب تک ناردرن ایریاز کے نام سے جانا جاتا تھا تبدیل کر کے گلگت بلتستان رکھ دیا۔8 اس وقت گلگت بلتستان میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت ہے۔ حافظ حفیظ الرحمٰن وزیر اعلی اور میر غضنفر علی خان گورنر ہیں۔

حکمران خاندان

گلگت بلتستان کے حکمران خاندانوں کو دو جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جنھوں نے گلگت کے علاقے میں حکمرانی کی جس میں مزید دو حصے شامل ہیں پہلے حصے میں گلگت، نگر، ہنزہ، پونیال، یاسین، غذر اور چترال شامل ہیں ۔ دوسری حصے میں وہ حکمران شامل ہیں جنھوں نے ذیلی علاقوں اور قبائلی علاقے جیسے گوہر آباد، چلاس، داریل، تانگیر، ہربن اور کوہستان کے کچھ علاقے جلکوٹ، پٹن اور کولائی پر حکومت کی۔

دوسرا حصہ بلتستان کا تھا ۔اس علاقے پر جس میں اسکردو، خپلو، شگر، روندو، استور، تولتی، کارگل اور دراز شامل ہیں، ایک اور حکمران گروہ نے حکومت کی۔ کارگل اور دراز کا علاقہ اب بھارت کے زیر اثر مقبوضہ کشمیر کا حصہ ہے۔ یہ دونوں خطے الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔بلتستان کی تاریخ کو ایک طرف لداخ اور تبت سے ملایا جاتا ہے، مغلیہ سلطنت میں اسے تبّتی خرد کہا جاتا تھا جبکہ گلگت اور اس کے ذیلی خطوں کی تاریخ کو بدخشاں اور کاشغر سے ملایا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر جن خاندانوں نے اس خطے پر حکمرانی کی ہے ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

الف۔

1۔ترا خان آف گلگت

2۔نگر کے مگلوٹ خاندان

3۔ ہنزہ کے آیاش خاندان

ب۔

1۔ چترال کا کٹور خاندان

2۔ یاسین اور مستوج کا خشوقت خاندان

3۔ پونیال کا بروشاہی خاندان

ج۔

1۔ اسکردو کے مقپون خاندان

2۔ استور، روندو اور تولتی کے راجہ خاندان

3۔شگر کے اماچس خاندان

4۔خپلو کا جگبوز خاندان[9]

سماجیات

اقوام

گلگت بلتستان میں بہت ساری قومیں آباد ہیں جس میں جشکن، چھین اور بلتی قوم اکثریت میں ہیں۔ اس کے علاوہ ڈوم، کمن، مغل، راجا، پٹھان، کشمیری، سونیوال اور کاشغری بھی یہاں آباد ہیں۔[10]

زبانیں

گلگت بلتستان میں اردو اور انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس خطے میں شینا زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اس کے علاوہ بلتی، بروشکی، وخی اور خوار زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔[11]

مذہبی گروہ

گلگت بلتستان کی آبادی تقریبا 1.8 ملین ہے۔ گلگت بلتستان میں چار بڑے مذہبی گروہ آباد ہیں۔ ان میں شیعہ 39 فیصد، سنی 27 فیصد، اسماعیلی 18 فیصد اور نوربخشی 16 فیصد ہیں۔[12]

ثقافت

گلگت بلتستان میں بہت ساری قومیں آباد ہے جن کا رنگ رہن سہن اور رسم و رواج ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے جس کی وجہ سے یہاں کی ثقافت بھی مختلف ہے۔ گلگت بلتستان کو دنیا کی چھت سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں سب سے زیادہ نمایاں ثقافت بلتی قوم کی ہے۔ مقامی سطح پر یہاں ثقافتی میلے منعقد ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ ثقافتی میلوں کی وجہ سے پاکستان کے دوسرے علاقوں بلکہ دنیا بھر سے سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں کا ایک اہم ثقافتی تہوار نوروز ہے جو کہ 2,500 سال سے ہر سال 21 مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اہم تہواروں میں بابا گنڈی فیسٹول اور وخی کا تہوار بھی شامل ہے جو روایتی جوش و جذبے سے منایا جاتا ہے۔[13]

طرز زندگی

گلگت بلتستان کے لوگوں کا طرز زندگی سادہ ہے۔ یہاں کے لوگ مہمان نواز ہوتے ہے اور سیر کے لیے آنے والے غیر ملکی سیاحوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور انکی رہنمائی کرتے ہے۔ اس خطے کے زیادہ تر لوگ مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ مرد ہوتا ہے جو پورے نظام کو چلاتا ہے۔ سربراہ فیصلہ دوسروں کی مشاورت سے کرتا ہے لیکن ہر معاملے میں آخری فیصلہ اسی کا ہوتا ہے۔ عورت کا کام گھر سنبھالنا ہوتا ہے لیکن اب چند علاقوں کے علاوہ تمام علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم عام ہوگئی ہے۔ لڑکیوں کو بچپن سے ہی گھر کی بڑی عورتیں یہ سکھاتی ہے کہ ان کا کام گھر سنبھالنا ہے۔ گلگت بلتستان میں بڑوں کا نہایت احترام کیا جاتا ہے اور بچوں کا بڑے لوگوں کا نام سے پکارنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔[14]

معاشی و سیاسی پس منظر

معیشت

گلگت بلتستان کی معیشت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سیاحت، زراعت، معدنیات اور ہائڈرو پاور یعنی پانی سے توانائی۔

سیاحت

گلگت بلتستان کی معیشت سیاحت پر منحصر ہے۔ یہ علاقہ قدرت کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ یہاں کے دریا، پہاڑ جھیلیں اور گلیشیرز پوری دنیا کے

سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہر سال لاکھوں سیاح اس خوبصورت وادی کا رخ کرتے ہیں جس سے ملک کثیر زرمبادلہ کماتا ہے۔

اس خطے میں دنیا کے تین مشہور تین پہاڑی سلسلے قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش، دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو (K-2)، گلیشئرز، کئی جھیلیں، چار نیشنل پارک، کئی پرندوں کی اقسام، کئی مچھلیوں کی اقسام اور آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے سیاح اس خطے کا رخ کرتے ہے۔ سال 2010 میں 62,000 سیاحوں نے اس خطے کا رخ کیا۔[15]

باغبانی

گلگت بلتستان کا دوسرا اہم شعبہ پھلوں کا ہے کیونکہ اس خطے میں کئی اقسام کے پھل پائے جاتے ہیں اور خشک میوہ جات کے حوالے سے بھی یہ علاقہ مالا مال ہے۔[16] گلگت بلتستان کی اس شعبے کی اہمیت دیکھ کر بہت سارے ممالک اس شعبے میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ انڈونیشیا کی حکومت باغبانی کے شعبے میں گلگت بلتستان کی حکومت سے زیادہ سے زیادہ تعاون کی خواہاں ہے۔ جاپان نے بھی باغبانی کے شعبے کے لیے 437 ملین روپے کی امداد دینے کی حامی بھری ہے۔ ایوان صنعت وتجارت اسلام آباد کے رکن احمد جاوید کا کہنا ہے کہ اس طرح کی سرمایہ کاری سے نہ صرف مقامی لوگوں کو فائدہ ہوگا بلکہ اس سے ملکی معیشت بھی مضبوط ہوجائے گی۔[17]

زراعت

زراعت کے حوالے سے دیکھا جائے تو گلگت بلتستان چونکہ پہاڑی علاقہ ہے اس لئے یہاں کھیتی باڑی کم ہوتی ہے اور گندم سمیت دیگر فصلیں وسیع پیمانے پر کاشت نہیں ہوتی۔ زیادہ تر گندم ملک کے دوسرے علاقوں سے یہاں لایا جاتا ہے۔ کچھ عرصے سے گلگت بلتستان کے بعض علاقوں میں آلو کاشت کیا جارہا ہے اور اسے ملک کے دوسرے شہروں میں بھی بھیجا جارہا ہے۔ اسی طرح مکئی کی فصل بھی کافی مقدار میں کاشت کی جاتی ہے۔

معدنیات

گلگت بلتستان تین بڑے پہاڑی سلسلوں کوہ ہندوکش، ہمالیہ اور کوہ قراقرم کے درمیان واقع ہے۔ ان پہاڑوں میں ہر قسم کے معدنیات پائے جاتے ہیں جن میں پکھراج، لعل، مرکت اور پیر یڈاٹ (Peridot) جیسی قیمتی معدنیات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مورگنائیٹ (Morganite)، سپائنل (Spinel)، سفین (Sphene) اور ٹورملائن (Tourmaline) جیسی معدنیات بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔[18]

قدرتی وسائل

پہاڑ

گلگت بلتستان کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ دنیا کے تین بڑے پہاڑی سلسلے کوہ قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ یہاں ملتے ہیں۔ اس خطے میں 6,000 میٹر سے 8611 میٹر بلندی کے کئی پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو بھی اسی خطے میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نگاپربت، راکاپوشی جیسے بلند و بالا پہاڑ بھی گلگت بلتستان کا حصہ ہیں۔[19]

دریا

گلگت بلتستان پاکستان کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل علاقہ ہے۔ دریاء گلگت جو دریا سندھ کی ایک اہم شاخ ہے گلگت بلتستان سے نکلتا ہے۔ دریاء گلگت درشندور سے نکل کر شمال کی طرف حرکت کرتا ہے راستے میں چھوٹی ندیوں کے ملاپ سے چاشی کے مقام پر یہ دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ دریا گوپس کے قریب دریا اشکومن سے مل جاتا ہے، جنوب کی طرف حرکت کرتا ہوا چتر کھنڈ سے گزر کر گاہکوچ کے قریب دریا غذر میں شامل ہوتا ہے۔ یہاں پر اس دریا کو دریاء گلگت کا نام دیا جاتا ہے جو کہ شیر قلعہ کے علاقے سے گزر کر گلگت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر شمال سے آتا ہوا دریا ہنزہ دریا گلگت سے مل جاتا ہے اور اس کے بعد دریا گلگت چند کلومیٹر کے بعد بونجی کے قریب دریا سندھ سے مل جاتا ہے۔ اس طرح دریاء گلگت کی لمبائی 240 کلومیٹر بنتی ہے۔[20]

گلیشیرز

ملک کے زیادہ تر گلیشیرز اس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ گلیشیرز اس خطے کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ دنیا کے تین بڑے گلیشیرز بیافو، بلترو اور بتورو جو پولر ریجن سے باہر ہیں گلگت بلتستان میں پائے جاتے ہیں۔ دیگر اہم گلیشیرز میں سیاچن، بترو اور ہسپر وغیرہ شامل ہیں۔[21]

آب وہوا

گلگت بلتستان میں چاروں موسم گرما، سرما، بہار اور خزاں پائے جاتے ہیں۔ اگر موسم

کے حوالے سے دیکھا جائے تو علاقے کے حساب سے موسم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے شمالی حصے میں کوہ ہمالیہ ہے جس کی وجہ سے مغربی حصے کا موسم نمدار ہوتا ہے لیکن قراقرم اور ہندوکش کے علاقوں میں موسم خشک ہوتا ہے۔ ضلع گلگت اور چلاس میں موسم گرما میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ دیگر علاقے جیسے استور، خپلو، یاسین، ہنزہ، نگر اور اسکردو میں پورے سال سردی رہتی ہے۔[22]

سیاسی مسائل

جغرافیائی اہمیت

جغرافیائی لحاظ سے گلگت بلتستان کا خطہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی طاقتیں امریکہ روس اور بھارت اس خطے پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کررہی ہیں۔ اس خطے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان اور چین کے درمیان زمینی رابطہ صرف اس خطے کے ذریعے ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا دنیا کے تین بڑے پہاڑی سلسلے قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ اس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے مغرب میں خیبر پختون خوا، شمال میں واخان، شمال مشرق میں چین، جنوب مغرب میں آزاد کشمیر اور مشرق اور جنوب مشرق میں جموں و کشمیر واقع ہے۔[23] بھارت نے کبھی اس خطے کو پاکستان کا حصہ تسلیم نہیں کیا اور اب بھی اسے جموں و کشمیر کا حصہ سمجھتا ہے۔ چین کے ساتھ تجارت کے حوالے سے یہ علاقہ اب انتہائی اہمیت حاصل کر گیا ہے کیونکہ پاکستان چین اقتصادی راہداری منصوبے کا داخلی راستہ ہی گلگت بلتستان ہے۔

گلگت بلتستان میں شیعہ فرقے کے لوگ اکثریت میں ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنایا جائے۔ ان کا دعوی ہے کہ گلگت بلتستان کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ ہی ان کی ثقافت ایک جیسی ہے۔ گلگت بلتستان کو مقامی لوگوں نے ہی ڈوگرہ راج سے آزاد کرایا اور علاقے کو پاکستان کے ساتھ ضم کیا۔ جبکہ سنی فرقے کے لوگ کشمیر کے ساتھ مل کر صوبہ بنانے کے حامی ہے کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اگر گلگت بلتستان ایک الگ صوبہ بنا تو سنی اقلیت میں ہو جائیں گے۔ اس اختلاف کی وجہ سے یہ دونوں فرقے آپس میں صوبے کے لیے کوشش نہیں کرتے جس کی وجہ سے اب تک اس خطے کی کوئی آئینی حیثیت نہیں۔[24]

چین پاکستان اقتصادی راہداری اور گلگت بلتستان

گلگت بلتستان کی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جس نے اس خطے کی معاشی اور سماجی ترقی پر دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان واقعات میں 1947 کی جنگ آزادی، آغا خان ڈیولپمنٹ نیٹ ورک کی آمد 1946، اسٹیٹ سبجیکٹ کے قانون کا خاتمہ 1974 اور قراقرم ہائی وے کی تعمیر 1978 شامل ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے 1994 میں لیگل فریم ورک آرڈر متعارف کرایا اور انتظامی معاملات مقامی لوگوں کے حوالے کر دئے گئے۔ 2009 میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے ہی ایک صوبے کا طرز نظام دے دیا جس میں گلگت بلتستان کی انتظامیہ وزیر اعلی اور گورنر کے ماتحت ہے۔

1978 سے پہلے گلگت بلتستان کا خطہ دنیا سے بلکل جدا تھا کیونکہ اس خطے کو پاکستان کے دوسرا علاقوں سے ملانے کے لیے راستے مشکل تھے جن پر آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی۔[25] لیکن قراقرم ہائی وے کی تعمیر کے بعد گلگت بلتستان کی پاکستان کے دوسرے علاقوں تک رسائی ہوگئی اور اس شاہراہ کی تعمیر سے گلگت بلتستان کی اہمیت بڑھ گئی۔ قراقرم ہائی وے کی تعمیر سے مقامی لوگوں کی زندگی آسان ہوگئی اور ان کی پاکستان کے دوسرے شہروں سے جڑت ہوگئی۔ قراقرم ہائی وے واحد راستہ ہے جو چین اور پاکستان کو آپس میں ملاتا ہے اور اس خطے کی وجہ سے ہی چین پاکستان کا ہمسایہ کہلاتا ہے۔ قراقرم ہائی وے جس کی لمبائی تقریبا 1,300 کلومیٹر ہے جو چین کے علاقے کاشغر سے شروع ہوکر گلگت سے ہوتے ہوئے حسن ابدل میں ختم ہوتا ہے۔ پاکستان کے پاس قراقرم ہائی وے کا 806 کلومیٹر کا حصہ ہے۔[26] اس کی تعمیر پاکستان اور چینی انجینئرز کی 20 سالہ انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔[27]

ایک طرف اس شاہراہ کی تعمیر سے لوگوں کی زندگی آسان ہوگئی اور ان کی معیشت میں انقلاب جیسی صورتحال پیدا ہوگئی۔ اگر ہم اس شاہراہ کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالیں تو اس کی خستہ حالت پر رونا آتا ہے، یہ شاہراہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے اور اگر ہلکی سی بارش بھی ہو جائے تو کئی دن تک بند ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطہ مذہبی انتہا پسندی کی دلدل میں پھنس چکا ہے اور یہ شاہراہ دہشت گردوں اور مذہبی انتہا پسندوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن چکی ہے جس کی گواہی پچھلے کچھ سالوں میں پیش آنے والے واقعات دیتے ہیں۔ ان واقعات میں غیر ملکی سیاحوں سمیت کئی لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ 22 جون، 2013 کو دہشت گردوں نے سیکورٹی فورس کی یونیفارم میں ننگا پربت پر فائرنگ کرکے 10 غیر ملکی سیاحوں کو ہلاک کیا تھا۔ 28[28] فروری، 2012 کو کوہستان کے علاقے میں شاہراہ قراقرم پر ایک فرقے کے 20 افراد کو شناختی کارڈ چیک کرنے کے بعد بسوں سے اتار کر بے دردی سے قتل کردیا گیا۔[29] اس طرح کے اور بھی واقعات اس شاہراہ پر رونما ہوئے ہیں۔

اس وقت جو اہم موضوع زیر بحث ہے وہ ہے پاکستان چین اقتصادی راہداری (سی پیک) جس کے تحت 46 بلین ڈالر کی لاگت سے چین پاکستان میں مختلف منصوبے تعمیر کرے گا جن میں توانائی، سڑکیں اور ریلوے کے منصوبے شامل

ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ تجزیہ کیا جائے کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری سے گلگت بلتستان جو کے اس منصوبے کا داخلی راستہ ہے پر کیا اثرات پڑتے ہیں اور اس کے عوام کے لیے کیا فوائد یا نقصانات ہیں، ہم اس خطے کے کچھ اہم مسائل کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

پاکستانی آئین اور گلگت بلتستان

سب سے پہلے اہم مسئلہ ہے کہ اب تک پاکستان نے اس خطے کو آئینی حقوق سے محروم رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطہ متنازعہ ہے اس لیے صوبہ نہیں بنا سکتے۔ اگر یہ متنازعہ علاقہ ہے تو اتنا بڑا منصوبہ متنازعہ علاقے میں کیسے تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ اس منصوبے کو مختلف ممالک کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کا یہاں تک کہنا ہے کہ گلگت بلتستان بھارت کا حصہ ہے اس لیے اس خطے میں یہ منصوبہ تعمیر نہ کیا جائے۔ مودی کے اس بیان کی افغان صدر اور بنگلہ دیش کی حکومت نے بھی حمایت کی ہے۔[30] بھارتی وزیر اعظم کے بیان کے ردعمل میں گلگت بلتستان کے وزیر اعلی کا کہنا تھا اس منصوبے کے خلاف مودی کے پروپیگنڈے کو مایوسی ہوگی اور اس منصوبے کے خلاف کی جانے والی تمام سازشوں کو ناکام بنایا جائے گا۔[31]

دوسری طرف گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کا تعین نہ کرنے کی میں ایک رکاوٹ کشمیر ہے۔ کیونکہ آزادی اور پاکستان سے الحاق سے پہلے گلگت بلتستان کا علاقہ کشمیر کی ایک ریاست تھی۔ 1935 میں انگریزوں نے اس خطے کی جغرافیائی اہمیت دیکھ کر مہاراجہ کشمیر سے یہ خطہ 60 سال کے لیے لیز پر لیا۔ اس خطے کی ذمہ داری مقامی سیکورٹی فورس گلگت اسکاؤٹ کے ذمے تھی جس کو انگریز افسران چلا رہے تھے۔ لیکن 1947 میں پاکستان اور بھارت کی آزادی کے بعد انگریزوں نے لیز کو ختم کیا اور اس خطے کو دوبارہ مہاراجہ کے حوالے کر دیا۔ مہاراجہ نے گنسارا سنگھ کو اس خطے کا گورنر نامزد کیا۔[32] لیکن جیسا کے پہلے بیان کیا گیا ہے مقامی آبادی بشمول گلگت اسکاؤٹ اور گنسارا سنگھ کی فوج کے مسلمان فوجیوں نے ملکر گنسارا سنگھ کے خلاف بغاوت کی اور اس خطے کو آزاد کرایا۔[33]

دوسری طرف کشمیر کے لوگ یہ دعوی کر رہیں کہ گلگت بلتستان کشمیر کا حصہ ہے۔ پاکستان اس خطے کو متنازعہ قرار دے کر آئینی حقوق نہیں دے رہا جبکہ دوسری طرف بھارت نے اس خطے اور وہاں کی آبادی کو آئینی طور پر اپنا شہری تسلیم کیا۔

آئینی حقوق کے لیے گلگت بلتستان کے عوام جدوجہد میں مصروف ہیں۔ گلگت بلتستان میں پیپلز پارٹی اور دوسری جماعتوں نے قراقرم ہائی وے پر جو کہ سی پیک کا حصہ ہے، اس حوالے سے ایک احتجاجی جلسے منعقد کیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ ان لوگوں کا موقف تھا کہ جب تک اس خطے کی آئینی حیثیت کا تعین نہیں کیا جاتا منصوبے پر عملدرآمد نہیں کرنے دیا جائے گا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے صوبائی صدر امجد ایڈوکیٹ کا کہنا تھا اگر گلگت بلتستان ایک متنازعہ علاقہ ہے تو سی پیک اس خطے سے کیسے گزر سکتا ہے؟ گلگت بلتستان کے عوام کو ان کے آئینی حقوق نہ ملے تو اس منصوبے کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔[34]

اب ہم اس منصوبے کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت چین پاکستان میں 26 اقتصادی زون قائم کرے گا۔ لیکن ابھی تک اس خطے کے لیے اس منصوبے میں کچھ مختص نہیں کیا گیا۔ اگر ہم معاشی اہمیت کی بات کریں تو خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس خطے کو کچھ نہیں ملنے والا۔ گلگت بلتستان کے حوالے سے سرتاج عزیز کی سربراہی میں جو کمیشن بنایا گیا تھا اس میں مقامی نمائندوں نے یہ شکایت کی کہ حکومت پاکستان گلگت بلتستان کو وفاق میں نمائندگی دیئے بغیر اس خطے کا استحصال کر رہی ہے۔ پاکستان اور چین کے درمیان جو 51 معاہدے ہوئے ہے اس میں گلگت بلتستان کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا۔ گلگت بلتستان کے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر منصوبے کی تعمیر اس منصوبے کے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔ اس وقت لوگ اپنا حق مانگنے کے لیے سڑکوں پر آرہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو یہ اس منصوبے کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔[35]

گلگت بلتستان اسمبلی کے اراکین نے سپیکر فدا محمد ناشاد کی سربراہی میں سی پیک منصوبے کے چیئرمین سینیٹر مشاہد حسین سید سے ملاقات کی اور ان سے گزارش کہ اس حوالے سے گلگت بلتستان کے عوام کا بھی موقف سنا جائے۔ وفد نے چیئرمین سے گلگت بلتستان کو بھی اس منصوبے میں دوسرے صوبوں کے برابر حقوق دینے کا مطالبہ کیا۔ چیئرمین کا کہنا تھا سی پیک کا داخلی راستہ ہی گلگت بلتستان ہے اس لئے اس خطے کو پورا حصہ دیا جائے گا۔[36]

اب اس منصوبے کا فائدہ کیا ہوگا؟ کس کو ہوگا؟ اس حوالے سے بھی خیال یہ ہے کہ کچھ سالوں کے اندر 3,218 کلومیٹر پر محیط یہ سڑک جو کاشغر، چین کو پاکستان سے ملائے گی اس کا سب سے زیادہ فائدہ چین کو ہوگا۔ چین اس وقت جو تیل درآمد کرتا ہے اس کا 80 فیصد آبنائے ملاکا (Malacca Strait) سے شنگھائی تک لایا جاتا ہے جو کہ 16,000 کلومیٹر طویل ہے اور اس سفر میں دو سے تین مہینے لگتے ہیں۔ اگر کاشغر سے گوادر تک شاہراہ تعمیر ہوئی تو یہ طویل راستہ 5,000 کلومیٹر سے بھی کم رہ جائے گا۔ گلگت بلتستان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس میں قراقرم ہائی وے کی بحالی کے علاوہ کوئی دوسرا منصوبہ شامل نہیں۔ اس منصوبے میں صرف سندھ اور پنجاب کے گیس اور کوئلے کے منصوبوں کو فوقیت دی گئی ہے۔ گلگت بلتستان میں اگر توانائی پیدا کرنے کے حوالے سے کام کیا جائے تو پاکستان سے توانائی کا بحران ختم ہوسکتا ہے۔[37]

تجارت

بعض مقامی تاجروں کا خیال ہے کہ اس منصوبے کی تعمیر سے تجارت کو فروغ ملے گا۔ گلگت بلتستان چونکہ پھلوں کی پیداوار کے حوالے سے ایک پہچان رکھتا ہے، اس منصوبے کی تعمیر سے گلگت بلتستان کے پھلوں کے لئے وسیع منڈی حاصل ہوگی۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ خطہ سالانہ 100,000 لاکھ ٹن خوبانی پیدا کرتا ہے۔[38] گلگت بلتستان کے تمام پھل کیڑے مار ادویات سے پاک تھے لیکن کچھ عرصے سے غیر ملکی اور بعض مقامی کمپنیاں باغبانی میں کیمیائی اشیاء استعمال کر رہی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس منصوبے سے گلگت بلتستان کے سیاحتی شعبے کو فروغ ملے گا۔ ترقیاتی ماہر اظہار ہنزائی کا کہنا ہے یہ منصوبہ گلگت بلتستان کے لیے سوائے آنکھوں میں دھول جھونکنے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ دونوں ممالک اس منصوبے سے فائدہ اٹھائیں گے مقامی آبادی کو صرف انڈے بیچنے کے علاوہ کچھ نہیں ملنے والا۔

ماحول

ایک اندازے کے مطابق سی پیک کی وجہ سے ہزاروں کنٹینز اس خطے سے گزریں جس سے ماحول پر کیا اثرات ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے ۔ اس خطے کا صاف ستھرا ماحول تباہ ہو جائے گا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا اس منصوبے سے اگر گلگت بلتستان کو کچھ نہ ملا تو دھواں ضرور ملے گا۔ سڑکوں کی تعمیر کے لیے پہاڑوں سے سرنگیں نکالی جائیں گی جس سے جنگلی حیات پر شدید منفی اثرات پڑیں گے اور شاید کچھ بلکل ہی ناپید ہوجائیں گے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے قدرتی آفات کا سامان تو رہتا ہی ہے، اب اس منصوبے سے انسان کی پیدا کردہ آفات کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس منصوبے سے سیاحتی شعبہ ترقی کرے گا تو یہ بلکل غلط ہوگا بلکہ عین توقع ہے کہ اس سے ہمارا سیاحتی شعبہ بھی تباہ ہو جائے گا جو کہ مقامی آبادی کے روزگار کا اہم ذریعہ ہے کیونکہ جب قدرتی خوبصورتی ہی ختم ہوجائے گی تو سیاح اس علاقے کا رخ کیوں کریں گے؟

روزگار

گلگت بلتستان کے لوگوں کا ایک اہم نقصان بیروزگاری کے حوالے سے ہے۔ مقامی مزدور ایک خوف میں مبتلا ہوگئے ہیں کیونکہ سوست گلگت میں چین کی سرحد کے پاس ایک ڈرائی پورٹ ہے جہاں پر چین سے آنے والے کنٹینرز رکتے ہیں اور سامان اتارا جاتا جس سے کئی لوگوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ تقریبا 10,000 سے زائد لوگ سوست پورٹ سے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں۔ اب ایک اطلاع کے مطابق سوست پورٹ کو ختم کیا جارہا ہے اور اسے خیبر پختون خوا کے علاقے حویلیاں منتقل کیا جارہا ہے جس سے بہت سارے لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔ خیال رہے کہ پورے گلگت بلتستان میں کوئی بڑی صنعت بھی نہیں ہے۔[39]

اگر زمینی قبضے کی بات کریں تو گلگت بلتستان میں زیادہ تر زمین پر بغیر کوئی معاوضہ دئے فوج، پولیس اور دوسرے نیم فوجی اداروں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ اب اس منصوبے کے لیے چیف سیکریٹری گلگت بلتستان کے لوگوں کی زمینوں کو سرکاری قرار دے کر بغیر معاوضے کے قبضہ کررہے ہیں۔ اگر یہ ناانصافی کا سلسلہ چلتا رہا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خطہ دوسرا بلوچستان بن جائے گا۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے خطے کی شرح خواندگی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور عوام میں شعور آچکا ہے، لیکن حکومت مختلف ہتھکنڈے استعمال کرکے عوام میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کررہی ہے۔

پاکستان چین اقتصادی راہداری کا پہلا 100 کنٹینر پر مشتمل آزمائشی قافلہ پاکستان کی سرزمین سے گزر چکا ہے۔ اس حوالے سے ایک تقریب گلگت بلتستان کے علاقے ہنزہ سوست میں ہوئی۔ تقریب میں چینی عہدیداروں، وزیر اعلی اور کور کمانڈر گلگت بلتستان نے شرکت کی۔ اس موقع پر وزیر اعلی گلگت بلتستان کا کہنا تھا کہ آج کا دن پاکستان اور چین کے لیے اہم دن ہے کیونکہ پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے کے تحت تجارتی سرگرمیاں سرکاری طور پر شروع کی گئی ہیں۔ اب یہ کنٹینرز کسٹم سے گزرنے کے بعد گوادر کے لیے روانہ ہونگے۔[40]

گلگت بلتستان کے لوگوں کو سوچنا ہے کہ اب بھی وقت نہیں گزرا اگر مقامی لوگ اپنے حق کے لیے آواز اٹھائیں تو کوئی بھی ان کو حقوق حاصل کرنے سے نہیں روک سکتا کیونکہ سب سے بڑی طاقت عوام کی ہی ہوتی ہے۔

حوالہ جات

1. History Pak.Com. "Gilgit Baltistan." Editor in Chief Farooq Ahmad Dar, History Pak. Accessed from http://historypak.com/gilgit-baltistan/

2. Bhittani, Asfandyar. "Wakhan Corridor ... an opportunity." Pakistan Defence, November 11, 2015. Accessed from https://defence.pk/pdf/threads/wakhan-corridor-an-opportunity.407932/

3.Gilgit Baltistan Scout. "Geography and demography of Gilgit Baltistan." Gilgit Baltistan Scout. Accessed from http://www.gilgitbaltistanscouts.gov.pk/geodemo.htm

4. Humshehri. "Gilgit Baltistan." Humshehri. Accessed from http://humshehri.org/place/gilgit-baltistan-2/

5. Dani, Ahmed Hasan. "History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000AD)." Sang-e-meel Publications, Lahore Pakistan 2001. P. 141.

6. Noor. "Azadi mubark to Gilgit Baltistan." Pamir times, October

http://mountaintv.net/china-pakistan-economic-corrdior-whats-in-it-for-gilgit-baltistan/
26. Pakistan Paedia. "The China-Pakistan friendship highway through paradise." Pakistan Paedia, January 20, 2009. Accessed from http://pakistanpaedia.com/landmarks/kkh/kkh.htm
27. Topping, Seymour. "Karakoram." The New York Times, December 2, 2017. Accessed from http://www.nytimes.com/1979/12/02/archives/article-6-no-title-karakoram.html?_r=1
28. Sherazi, Zahir Shah. "Gunmen kill nine foreign tourists and their guide in Nanga Parbat." Dawn, June 24, 2013. Accessed from https://www.dawn.com/news/1020142
29. Hunzaie, Izhar. "Conflict dynamics in Gilgit Baltistan." United States Institute of Peace 2013. Accessed from (https://www.usip.org/sites/default/files/SR321.pdf
30۔ حیدر، ولی۔ "چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبہ (سی پی ای سی): اثرات اور مضمرات۔" چیلنج، جنوری تا اپریل، 2016، صفحہ 5-2۔
31. Rana, Shahbaz. "Modi's remarks on Gilgit-Baltistan shows frustration over CPEC: G-B CM." The Express Tribune, August 31, 2016. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1173589/modis-remarks-gilgit-baltistan-shows-frustration-cpec-cm-gb/
32. Singh, Sushant. "Story of Gilgit-Baltistan: snatched by British, occupied by Pakistan." The Indian Express, August 18, 2016. Accessed from http://indianexpress.com/article/explained/the-story-of-gilgit-baltistan-pm-modi-balochistan-india-pakistan-2981634/
33. GB Tribune. "History and dispute." GB Tribune. Accessed from http://gbtribune.blogspot.com/p/history-dispute.html
34. Dawn. "PPP organises rally in GB against centre's apathy." Dawn, November 2, 2016. Accessed from https://www.dawn.com/news/1293787
35. Mountaintv.net. "China-Pakistan Economic Corrdior: what's in it for Gilgit Baltistan?." Mountaintv.net. Accessed from http://mountaintv.net/china-pakistan-economic-corrdior-whats-in-it-for-gilgit-baltistan/
36. The Nation. "Gilgit Baltistan is pivotal to CPEC, says Mushahid." The Nation, February 1, 2016. Accessed from http://nation.com.pk/national/01-feb-2016/gilgit-baltistan-is-pivotal-to-cpec-says-mushahid
37. Shigri, Afzal, A. "No space for GB on CPEC table." Dawn, January 11, 2016. Accessed from (http://www.dawn.com/news/1232094
38. Pakistan today. "CPEC will boost living standard, increase tourism in GB." Pakistan today, June 19, 2016. Accessed from https://www.pakistantoday.com.pk/2016/06/19/cpec-will-boost-living-standards-increase-tourism-in-gb/
39. Muhammad, Peer. "CPEC to cause unemployment in Gilgit Baltistan." The Express Tribune, November 16, 2015. Accessed from https://tribune.com.pk/story/992728/anticipating-effects-cpec-to-cause-unemployment-in-gilgit-baltistan/
40. Nagri, Jamil. "First trade activity under CPEC kicks off." Dawn, November 1, 2016. Accessed from https://www.dawn.com/news/1293574
29, 2008. Accessed from http://pamirtimes.net/2008/10/29/azadi-mubarak-to-gilgit-baltistan/
7. Ibid.
8. Ali, Zulfiqar, Naqash, Tariq and Nagri, Jamil. "Almost Pakistan: Gilgit Baltistan in a constitutional limbo." Dawn, Janaury 19, 2017. Accessed from https://www.dawn.com/news/1198967
9. Dani, Ahmed Hasan. "History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000AD)." p.165-166.
10. Gilgit Baltistan Scout. "Geography and demography of Gilgit Baltistan." Gilgit Baltistan Scout. Accessed from http://www.gilgitbaltistanscouts.gov.pk/geodemo.htm
11. Gilgit-Baltistan. "The land of spectacular mountains, valleys, rivers and glaciers." Hunza Guides Pakistan 2016. Accessed from http://hunzaguidespakistan.com/gilgit-baltistan/
12. Butt Manzoor, Khalid and Zaigham Abbas. "Ethnic diversity and collective action in Gilgit Baltistan." Journal of Political Science XXXII 2014 GC University Lahore. 37. Accessed from http://ps.gcu.edu.pk/wp-content/uploads/2015/02/2014-Butt-Zaighan.pdf
13. Hinazahir. "Cultural review of Gilgit Baltistan." Daaira, January 20, 2012. Accessed from http://daaira.com/culture/cultural-review-of-gilgit-baltistan/
14. History Pak. "Gilgit-jewel of Pakistan." Historypak. Accessed from http://historypak.com/gilgit-jewel-of-pakistan/
15. Sikandar, Baloch Imran. "Tourism development in Gilgit Baltistan." Tourism Department, Government of Gilgit Baltistan. Accessed from http://www.gilgitbaltistan.gov.pk/DownloadFiles/InvestmentPotential/Tourism.pdf
16. Humshehri. "Gilgit Baltistan economy." Humshehri. Accessed from http://humshehri.org/place/gilgit-baltistan-economy/
17. Mirza, Iqbal. "Gilgit-Baltistan: horticulture exports could fetch billions." Business Recorder, April 26, 2012. Accessed from http://fp.brecorder.com/2012/04/201204261182473/
18. Green Society Development Network Baltistan." Minerals in Gilgit Baltistan." GSDNB. Accesseed from http://gsdn.gbit.pk/2015/09/minerals-in-gilgit-baltistan.html
19. Gilgit Baltistan Scout. "Mountain ranges." Gilgit Baltistan Scout. Accessed from http://www.gilgitbaltistanscouts.gov.pk/toMountains.htm
20.Tariq, Ali. "Gilgit and around." History Pak. Accessed from http://historypak.com/gilgit-baltistan-2/
21. Pakistan 360 Degrees. "Pakistan tourism: top ten glaciers of Pakistan." Pakistan 360 Degrees. Accessed from Pakistan360degrees.com/tag/gilgit-baltistan/
22. History Pak. "Gilgit Baltistan." History Pak. Accessed form http://historypak.com/gilgit-baltistan/
23. Gilgit Baltistan Scout. "Geography and demography of Gilgit Baltistan." Gilgit Baltistan Scout. Accessed from http://www.gilgitbaltistanscouts.gov.pk/geodemo.htm
24. GB Tribune. "History and dispute." GB Tribune. Accessed from http://gbtribune.blogspot.com/p/history-dispute.html
25. Mountaintv.net. "China-Pakistan Economic Corrdior: what's in it for Gilgit Baltistan?." Mountaintv.net. Accessed from

زرعی مداخل پر حکومتی مراعات، کس کے لیے؟

تحریر: ولی حیدر

زراعت کے شعبہ میں سرمایہ کاری ایک پرکشش کاروبار کے طور پر سامنے آ رہا ہے۔ موسمی بحران نے زرعی کاروبار کو مزید پرکشش بنا دیا ہے۔ پہلے نو آبادیات اور پھر بین الاقوامی کمپنیوں نے زراعت اور زراعت سے جڑے تمام شعبوں پر اپنا پنجہ اس حد تک گاڑ دیا ہے کہ بظاہر اس گرفت سے نکلنا ناممکن نظر آتا ہے۔ قومی اسمبلی میں پیش کردہ مجوزہ سیڈ ایکٹ بھی دیوہیکل بین الاقوامی زرعی کمپنیوں اور عالمی زرعی سرمایہ کاروں کے لیے راہ ہموار کرنے کی ایک بھیانک سازش ہے۔ اس قانون سازی کے بعد کسان جو کہ بیج اور زراعات کا اصلی وارث ہے بین الاقوامی کمپنیوں اور منڈی کی مکمل محتاجی کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔

پاکستانی معیشت، صنعتوں پر زوال کی وجہ سے پہلے ہی تباہی کا شکار ہے کیونکہ قومی آمدنی کا بڑا حصہ خدمات کے شعبہ مثلاً بینکنگ، ٹیلی کمیونیکیشن، مواصلات اور دیگر شعبوں سے حاصل ہو رہا ہے۔

ان حالات میں حکومت وقت کو ملک کے کثیر آبادی خصوصاً چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی معاشی خودمختاری کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت تھی اور انہیں خصوصی مراعات دی جانی چاہیے تھی تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے۔ اس کے برعکس حکومت نے سرمایہ کاروں اور صنعتوں کو مراعات دینے کا فیصلہ کیا۔ بظاہر تو یہ بتایا جا رہا ہے کہ زرعی صنعتوں خصوصاً کھاد اور کیڑے مار زہر کی صنعتوں کو جو مراعات دی جا رہی ہے اس سے کسانوں کو فائدہ ہوگا مگر درحقیقت اس سے اصل فائدہ ان کارخانہ داروں کو ہی ہوگا جو پہلے ہی بیش بہا سرمایہ کے مالک ہیں۔

پچھلے چند ماہ کے اخبارات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں زرعی صنعتوں کی جانب سے مختلف اشتہارات نظر آتے ہیں۔ ان اشتہارات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کھاد کی صنعت کے مالکان بہت خوش ہیں۔ جس میں ایگرو فرٹیلائزر، فاطمہ فرٹیلائزر اور پاک عرب فرٹیلائزر شامل ہیں۔ ان اشتہارات میں یہ کمپنیاں حکومت کا شکریہ ادا کرتے نظر آتے ہیں کہ حکومت نے کھاد کی صنعت کے لیے مراعات کا اعلان کیا۔ اشتہارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نائٹرو فاس (NP:22:20) کی قیمتوں پر مراعات دی گئی جس کی پہلے قیمت 2,066 روپے تھی اور کم کر کے 1,936 روپے کر دی گئی۔ یوریا، ڈی اے پی اور زنک پر بھی کھاد کی صنعتوں کو خاطر خواہ مراعات فراہم کی گئی جسے جدول 1 میں بیان کیا جا رہا ہے۔

دیگر اشتہارات سے پتہ چلتا ہے کہ کیڑے مار ادویات کے ادارے (پاکستان کراپ پروٹیکشن) نے بھی حکام بالا سے زرعی زہریلے مواد پر سات فیصد

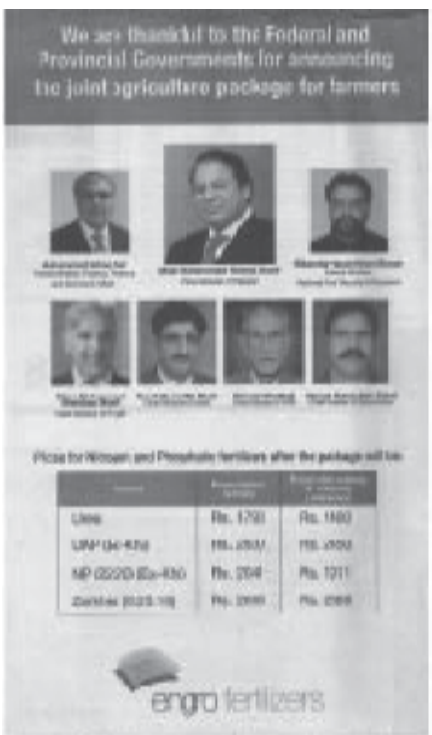

Dawn, August 9, 2016. p 2.

Dawn, August 9, 2016. p 2.

Dawn, August 9, 2016. p 2.

جنرل سیلز ٹیکس کو سفر فیصد کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔[1] اسی طرح یوریا کھاد پر جنرل سیلز ٹیکس کو بھی 17 فیصد سے پانچ فیصد کم کردیا گیا ہے اور ساتھ ہی ڈی اے پی کے لیے بھی جنرل سیلز ٹیکس کو 17 فیصد سے پانچ فیصد کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔[2] شکریہ کے اشتہارات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حکومت کی اعلان کردہ مراعات سے ان صنعتوں سے وابستہ سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں کے منافع کو یقینی بنایا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حکومت نے کھاد پر مراعات کھاد کی صنعت کو ڈبونے سے بچانے کے لیے دیا ہے کیونکہ ایک خبر کے مطابق سال 2011 میں کھاد کا مجموعی کاروبار 110 بلین روپے تک پہنچ گیا تھا مگر بتدریج کم ہوتا ہوا پچھلے سال صرف 21 بلین روپے تک رہ گیا۔[3]

سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ زرعی شعبوں میں حکومتی مراعات کا جیسے ہی اعلان ہوا دیگر شعبوں اور صنعت کو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ مثلاً ڈبوں کے دودھ کی صنعت نے اپیل کر ڈالی کہ درآمد شدہ ڈبوں کے دودھ سے حاصل کردہ ریگولیٹری ڈیوٹی میں اضافے کو واپس لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ریگولیٹری ڈیوٹی میں اضافہ واپس نہ لیا گیا تو مندرجہ ذیل اثرات نظر آئیں گے:

- دودھ اور دودھ سے تیار کردہ مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ۔
- مقامی اور بیرونی سرمایہ کاری میں رکاوٹ۔
- مقامی کسانوں سے دودھ کے حصول میں کمی۔
- چھ لاکھ گوالوں کے روزگار پر شدید منفی اثرات۔
- ڈیری شعبے کی ترقی پر منفی اثرات۔
- دودھ عام لوگوں کی پہنچ سے دور ہونے کی وجہ سے غذائی کمی کا شکار کے اعداد وشمار میں مزید اضافہ۔

ان تمام اشتہارات میں یہ بتانے اور جتلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ان اقدامات سے کسانوں کو فائدہ حاصل ہوگا۔ یہاں یہ سمجھنا پڑے گا کہ کسانوں کی تباہی کی اصل وجہ کیا ہے؟ کسانوں کی تباہی کی وجہ منڈی سے بیج، کیمیائی کھاد، زہریلا مواد اور مشینوں کا استعمال ہے جس کے نتیجے میں پیداواری لاگت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ جب پیداوار منڈی میں آتی ہے تو کسانوں کو اس کی قیمت انتہائی کم ملتی ہے جس سے اس فصل پر ہونے والے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ اگر اس نقطہ پر مزید سوچا جائے تو واضح نظر آتا ہے کہ کسان کے اگائے گندم پر اس کو تو سہولیات نہیں دی جارہی لیکن تاجر جو کہ پاکستان میں اگائی گندم کو بیرون ملک فروخت کررہے ہیں کو 70-50 ڈالر فی ٹن مراعات فراہم کی جارہی ہے۔ اس موضوع پر اس شمارے میں مزید معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔

دوسری طرف چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی حالات زار کو بہتر کرنے کے لیے حکومت نے کیا اقدام اٹھائے؟ عام خیال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ زرعی مداخل پر مراعات دراصل کسانوں کے لیے ہی مددگار ثابت ہوں گی۔ دراصل اس بات کا حقیقت سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ کسانوں سے غیر رسمی بات چیت سے کچھ نکات سامنے آئے:

1۔ چھوٹے بے زمین کسان تو نقد رقم دے ہی نہیں پاتے۔ یہ طبقہ فصل کٹنے پر مداخل بیچنے والے دکانداروں کو بمعہ سود رقم واپس کرتے ہیں۔

2۔ کسان جو حصہ پر کام کرتے ہیں ان کے لیے بھی مراعات بے سود ہے۔ کیونکہ ان کے حصے کی پیداواری لاگت جاگیردار ادا کرتے اور پھر فصل کٹنے پر بمعہ سود وصول کی جاتی ہے۔

3۔ گاؤں کی سطح پر قیمت کا زیادہ فرق نہیں تھا۔ مثلاً ڈی اے پی کی پرانی قیمت 2,830 روپے تھی جبکہ مراعات کے بعد اس کی قیمت 2,450 روپے کردی

گئی۔ مگر گاؤں یا چھوٹے شہروں میں مشکل سے اس قیمت پر کسانوں کو ڈی اے پی دستیاب ہوا۔

4۔ کچھ کسانوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب سے قیمتوں میں کمی کا اعلان ہوا ہے، نقلی کھاد پہلے سے زیادہ منڈی میں بک رہی ہے جس کی وجہ سے ایک بوری کے بجائے ڈیڑھ سے دو بوری ڈالنی پڑ رہی تھی۔

اگر مراعات واقعی چھوٹے کسانوں کی مدد کے لیے دی گئی تھی تو پھر سوچنے کے لیے یہ نقطہ بھی اہم ہے کہ حکومت نے کسانوں کو براہ راست مراعات دینے کے بجائے صنعتوں کو براہ راست مراعات کیوں فراہم کی؟ کچھ طبقوں کا خیال ہے کہ مراعات کے مد میں کسانوں کو براہ راست رقم کی فراہمی زیادہ مفید ہوسکتی ہے۔[4]

واضح رہے کہ حکومت کسانوں کے بجائے سرمایہ کاروں کی مدد کے لیے کوشاں ہے وگر نہ یہ مراعات ان شعبوں میں دی جاتی ہے جس سے پائیدار زراعت کا فروغ ہوتا اور کسان کھیتی باڑی میں خود مختار ہوتا۔ کسان اور قوم کی خود مختاری کے لیے سب سے اہم قدم تو بحرحال زمینوں کا منصفانہ اور مساویانہ بٹوارہ ہے۔ 1960 کی دہائی میں سبز انقلاب کی پالیسی نافذ کرنے کے بعد سے لے کر اب تک جو کیمیائی کھاد اور زہریلے کیڑے مار مواد کا انتہائی نقصاندہ استعمال کیا جارہا ہے اس کے خلاف حکمت عملی پیش کرنا دوسرا اہم قدم ہونا چاہیے تھا۔ بنجر ہوتی زمینوں کی زرخیزی بحال کرنے کے لیے سبز کھاد، جانوروں کا گوبر اور دیگر پائیدار، انسان و ماحول دوست طریقے وضع کیے جانے چاہیے تھے۔ کیڑوں کے حملوں سے بچنے کے لیے حیاتیاتی کیڑے مار مواد کا استعمال پر تحقیق و تربیت کے لیے تدبیر پیش کی جانی چاہیے تھی۔ روایتی پائیدار، ماحول دوست بیجوں کی نشاندہی کی جاتی اور ان سارے اقدامات کو اپناتے ہوئے ایک خود مختار، قرض سے آزاد، غلامی سے نجات معاشرے کی تشکیل دی جاتی لیکن پاکستان کی غلام اشرافیہ بھلا ایسے اقدامات کیوں کر کرتی؟

ہائبرڈ اور جینیاتی بیجوں کے بجائے روایتی دیسی بیج کے فروغ سے لے کر جانوروں کے گوبر سے کھاد اور زہریلی کیڑے مار ادویات کے بجائے جڑی بوٹیوں سے کیڑوں سے بچاؤ کے فروغ جیسے اقدامات کے لیے مراعات اور ترغیب سے نہ صرف کسانوں کی خود مختاری کی راہ ہموار کی جاسکتی تھی بلکہ ملک کے لیے صاف ستھری اور صحت مند خوراک کی فراہمی بھی ممکن بنایا جاسکتا تھا۔

پنجاب اور سندھ میں ایک عارضی مشاہداتی تجربہ کے نتیجہ سے ثابت ہوا ہے کہ پائیدار زراعت کو فروغ دیا جائے اور اپنایا جائے تو نہ صرف پیداواری اخراجات انتہائی کم ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ گھرانے کے لیے صحت مند گندم، چاول، سبزیاں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔[5] اس مشاہداتی تجربہ سے وابسطہ کسان جو آدھے ایکڑ سے پانچ ایکڑ تک کے کاشتکار تھے کا کہنا تھا کہ روایتی طور پر پائیدار طریقہ کاشتکاری کے نتیجہ میں پہلے دو سال تک تو پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہیں مگر تیسرے سال سے پیداوار میں اس حد تک تیزی آجاتی ہے کہ اسے مصنوعی کھاد یا مشینی طریقہ زراعت کے پیداوار سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اکثر کسانوں کا کہنا تھا کہ چونکہ زمین کھاد، زرعی ادویات کے مسلسل استعمال کے نتیجہ میں خراب ہوگئی ہے اور اس کی زرخیزی واپس لانے میں دو سے تین سال درکار ہوتے ہی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اب وہ منڈی سے بار بار بیج نہیں لیتے اور نہ ہی زہریلے مواد اور نہ ہی کیمیائی کھاد جس کے نتیجے میں بچت ہوتی ہے اور اس طرح وہ قرض اور سود سے بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور اہم نقاط بھی قابل غور ہیں۔ ایک، ان کے مطابق کیونکہ وہ کیمیائی اور زہریلی مواد کا استعمال نہیں کررہے تھے تو ان کی طبیعت بہتر رہتی تھی اور آئے دن کی بیماری میں کمی نظر آئی۔ دوسرا اہم نقطہ تھا کہ زہر سے پاک خوراک بھی ان کی بہتر صحت کی وجہ تھی۔ اگر حکومت پاکستان واقعی کسان، عوام اور ماحول کی بہتری چاہتی تو کم از کم اس قسم کی تحقیق اور تجرباتی منصوبوں پر مراعات فراہم کرتی جس سے کہ ایک دیرپا پائیدار زرعی حکمت عملی اپنائی جاسکتی۔ مگر ہمیشہ کی طرح ہماری حکومت کی اولین ترجیح عوام کی ترقی، خود مختاری، خوشحالی کے بجائے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ ہے!

حوالہ جات

1. Dawn, May 24, 2016, p. 16.

2. Business Recorder, June 8, 2016, p. 1.

3. Jamil, Farah. "Subsidy on fertilizer." Business Recorder, July 18, 2016.

4. Ibid.

5. Roots for Equity. "Sustaining lives and livelihood: fighting climate crisis in rural communities. An internal assessment report." Roots for Equity, 2016.

گندم، زرتلافی اور غذائی کمی

تحریر: جنید احمد

گندم پاکستان کی انتہائی اہم غذائی فصل ہے جو ملکی معیشت و زراعت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان گندم پیدا کرنے والا دنیا کا نواں بڑا ملک ہے۔ 2015 کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں گندم کی طلب 24.4 ملین ٹن تھی[1] جبکہ سال 16-2015 میں 9.26 ملین ہیکٹر رقبے پر 25.45 ملین ٹن گندم کی پیداوار ہوئی۔ گندم کی فصل سے نہ صرف پوری قوم کا غذائی تحفظ وابستہ ہے بلکہ لاکھوں افراد کا روزگار بھی جڑا ہے۔ اس وقت ملک میں گندم کا نو ملین ٹن سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے[2] جس میں سے تین ملین ٹن ضرورت سے زائد ہے جسے برآمد کیا جاسکتا ہے۔

13 دسمبر، 2016 کو وزیر خزانہ اسحاق ڈار کی سربراہی میں اقتصادی رابطہ کمیٹی نے گندم برآمد کرنے کی انتہائی تاریخ میں ایک بار پھر توسیع کرکے 30 نومبر سے بڑھا کر 31 دسمبر 2016 کردی۔ اسی کمیٹی نے چھ ماہ پہلے 120 ڈالر فی ٹن زرتلافی کے ساتھ 900,000 ٹن گندم برآمد کرنے کی اجازت دی تھی اور حال ہی میں کمیٹی کے ہونے والے اجلاس میں گندم سے تیار کردہ اشیاء مثلاً میدہ، سوجی اور آٹا بھی اسی ہدف میں شامل کرلیا گیا ہے یعنی گندم برآمد کنندگان کے ساتھ ساتھ آٹا مل مالکان بھی اس سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر گندم سے تیار شدہ اشیاء برآمد کرسکتے ہیں۔ گندم کی برآمد میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت عالمی منڈی میں قیمت میں غیر معمولی کمی ہے۔ کراچی گروسرز ایسوسی ایشن کے سربراہ کے مطابق اس وقت عالمی منڈی میں گندم کی قیمت 160 سے 170 ڈالر فی ٹن ہے۔

حکومت ملکی ضروریات کے لیے گندم کی فراہمی یقینی بنانے اور قیمت کو اختیار میں رکھنے کے لیے کسانوں سے گندم امدادی قیمت پر خریدتی ہے۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی حکومت کی طرف سے گندم کی امدادی قیمت 1,300 روپے فی من (40 کلوگرام) مقرر کی گئی۔ حکومت نے سال 16-2015 کی تقریباً 25 ملین ٹن پیداوار میں سے 6.95 ملین ٹن گندم کسانوں سے خریدنے کا ہدف مقرر کیا تھا۔ کسانوں سے گندم خریدنے کے لیے حکومت کی طرف سے باردانہ (بوریاں) فراہم کیا جاتا ہے جس میں بھرا گیا گندم حکومت کی جانب سے قائم کیے گئے گندم خریداری کے مراکز پر کسان سے خرید لیا جاتا ہے۔ ملک میں کھلی منڈی میں گندم کی قیمت تقریباً 1,100 روپے فی من ہے یعنی ایک ٹن (1,000 کلو گرام) گندم کی قیمت 27,500 روپے ہے۔ حکومت کی مقرر کردہ امدادی قیمت 1,300 روپے فی من یعنی 32,500 روپے فی ٹن ہے۔

وفاقی حکومت بشمول صوبائی حکومتیں گندم کی 27.8 فیصد پیداوار خریدتی ہیں یعنی بقیہ تقریباً 70 فیصد پیداوار کسان منڈی کی قیمت 1,100 روپے فی من پر فروخت کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں باردانے کا حصول کسانوں کے لیے ایک مشکل عمل ہے جو عموماً محکمہ خوراک اور دیگر انتظامی اداروں کے منظور نظر افراد کو فراہم کیا جاتا ہے یوں حکومت کی جانب سے گندم کے کاشتکاروں کو دی جانے والی یہ زرتلافی بڑے زمینداروں کی جیب میں چلی جاتی ہے اور اکثر خصوصاً سندھ میں چھوٹے اور بے زمین کسان اس سے محروم رہ جاتے ہیں اور احتجاج پر مجبور ہوتے ہیں۔

پاکستان چونکہ عالمی تجارتی ادارے (World Trade Organisation/ WTO) کا رکن ہے اس لیے اس کے تمام معاہدوں کا پابند ہے۔ پاکستان WTO (ڈبلیو ٹی او) کے عالمی زرعی معاہدے کے تحت زرعی درآمدات پر پابندی عائد نہیں کرسکتا تاہم ایک حد تک درآمدی اشیاء پر محصولات عائد کرسکتا ہے۔ وہ ممالک جو اپنے عوام کو خوراک کی پیداوار اور حصول پر مراعات فراہم کرنا چاہتے ہیں وہ ڈبلیو ٹی او میں سخت موقف رکھتے ہوئے اس پر مزاکرات کرکے اپنا نقطہ نظر منواتے ہیں۔ اس کی ایک مثال 2013 میں بالی، انڈونیشیا میں ہونے والے ڈبلیو ٹی او کے اجلاس میں بھارت نے پیش کی تھی یعنی اگر پاکستان چاہے تو ملک میں طلب و کھپت کے تناظر میں محصولات عائد کرسکتا ہے جس سے مقامی پیداواری طبقہ متاثر نہ ہو۔ ڈبلیو ٹی او کا زرعی معاہدہ ہی حکومتوں پر زبردستی یہ شرط عائد کرتا ہے کہ وہ بنیادی اناج کو بھی ملک میں درآمد کرنے پر مجبور ہوں، شاید اسی شرط کے تناظر میں وفاقی حکومت نے 2015 میں یوکرین سے سات لاکھ ٹن گندم درآمد کرنے کی اجازت دی جو نہ صرف غیر معیاری تھی بلکہ اس سے مقامی منڈی میں گندم کی فراوانی ہوئی جس کے نتیجے میں کھلی منڈی میں قیمت تو کم ہوئی لیکن خود حکومت کے گندم کے ذخائر بھی گوداموں میں پڑے رہ گئے جسے فروخت کرنے کے لیے حکومت ایک طرف تو بھاری زرتلافی دینے پر مجبور ہے دوسری طرف ان گوداموں اور گندم کے ذخائر کے انتظامی اخراجات بھی برداشت کررہی ہے۔ سات لاکھ ٹن گندم کی درآمد کے معاملے پر تفتیشی کمیٹی بھی بنائی گئی جس کی رپورٹ تا حال عام نہیں کی گئی اور قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی بھی اس معاملے میں اب تک ذمہ داروں کا تعین نہیں کرپائی ہے۔

درج بالا گندم کی پیداوار اور کھپت کے اشارے ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت صرف گندم کی ہی تقریباً ایک ملین ٹن اضافی پیداوار ہورہی اور ملک میں خوراک کا کوئی بحران نہیں ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان میں 29.5

فیصد آبادی (تقریباً 55 ملین افراد) خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے، یعنی یہ افراد یومیہ ایک ڈالر یا اس سے کم آمدنی حاصل کرتے ہیں جبکہ خط غربت کا عالمی معیار دو ڈالر یومیہ ہے۔ پاکستان میں 2016 تک کے غذائی کمی کے اشارے بتاتے ہیں کہ ملک میں پانچ سال سے کم عمر کے 9.9 ملین بچے نشونما میں کمی کے شکار ہیں۔ اس مناسبت سے بھارت اور نائجیر یا کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ غذائی کمی کے شکار بچے پاکستان میں ہیں۔ وفاقی محتسب اور اقوام متحدہ کے بچوں کی بہبود کے عالمی ادارے یونیسیف کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بچوں کی شرح اموات بہتر نہیں ہوئی۔ ہر 14 پاکستانی بچوں میں سے ایک بچہ ایک سال کی عمر سے پہلے اور ہر 11 میں سے ایک بچہ اپنی پانچویں سالگرہ سے پہلے مرجاتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن اور عالمی غذائی پروگرام (World Food Programme/WFP) کی جاری کردہ رپورٹ (Minimum Cost of the Diet) کے مطابق ملک میں ہر تین میں سے دو گھرانے غذائی کمی کے شکار ہیں۔ اگر صوبوں کی سطح پر دیکھا جائے تو بلوچستان میں 83.4 فیصد، سندھ میں 70.8 فیصد، خیبر پختون خوا میں 67.4 فیصد اور پنجاب کے 65.6 فیصد گھرانے غذائی کمی کے شکار ہیں۔[3]

ملک میں غربت، بھوک اور غذائی کمی کے خاتمے کے لیے حکومت بڑے پیمانے پر پالیسی سازی کررہی ہے اور اس حوالے سے کئی منصوبے عالمی امدادی اداروں کے ساتھ بھی جاری ہیں۔ حکومت ایک طرف زرعی پیداواری شعبے میں اصلاحات کرکے خوراک کی پیداوار میں اضافے کے لیے جدید بائیو فورٹیفیکیشن (Bio Fortification) کوفروغ دیتے ہوئے ملک میں جینیاتی ٹیکنالوجی متعارف کروارہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرکے ملک سے غربت کا خاتمہ کیا جاسکے اور دوسری طرف غذائی کمی کی شکار آبادی کو اضافی غذائیت کی حامل خوراک بذریعہ فوڈ فورٹیفیکیشن فراہم کررہی ہے۔

فوڈ فورٹیفیکیشن

عالمی ادارہ صحت (World Health Organization/WHO) کے مطابق فوڈ فورٹیفیکیشن سے مراد ہے ''آبادی یا اس کے مخصوص گروہ میں کسی ایک یا ایک سے زائد اجزاء کی کمی کو دور کرنے یا اس کی کمی سے تحفظ کے لیے خوراک میں ایک یا ایک سے زیادہ لازمی غذائی اجزاء شامل کرنا، چاہے یہ اجزاء اس خوراک میں قدرتی طور پہ پائے جاتے ہوں یا نہیں''۔[4]

(the addition of one or more essential nutrients to a food, whether or not it is normally contained in the food, for the purpose of preventing or correcting a demonstrated deficiency of one or more nutrients in the population or specific population groups)

خوراک میں اضافی غذائیت شامل کرنے کے لیے عموماً وٹامن۔اے، زنک، آیوڈین، فولاد اور فولک ایسڈ شامل کیا جاتا ہے۔

برطانوی امدادی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (Department for International Development/DFID) نے ستمبر 2016 میں ملک میں غذائی کمی کے شکار افراد خصوصاً بچوں اور عورتوں کے لیے حکومت پاکستان کے اشتراک سے فوڈ فورٹیفیکیشن پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ ادارہ اس پروگرام کے تحت وفاقی، صوبائی اور ضلعی سطح پر تکنیکی مدد بھی فراہم کرے گا۔ اس کے علاوہ لیباٹری میں جانچ کا نظام، آٹا مل مالکان کو اعلی معیار کا غذائیت سے بھرپور آٹا تیار کرنے کے لیے زرتلافی اور تکنیکی مدد بھی فراہم کرے گا۔ پروگرام کا مقصد ہے کہ اگلے پانچ سالوں میں پاکستان کی آدھی آبادی فورٹیفائڈ آٹا استعمال کرے اور دو تہائی سے زیادہ آبادی وٹامن اے اور وٹامن ڈی ملا گھی اور تیل استعمال کرے جس کے لیے 1,000 سے زیادہ آٹا مل اور 100 گھی اور تیل بنانے والے کارخانے کام کررہے ہوں۔[5]

DFID (ڈیفڈ) کا یہ پروگرام حکومت پاکستان، پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن، پاکستان وناسپتی مینوفیکچررز ایسوسی ایشن (PVMA)، پاکستان اسٹینڈرڈ اینڈ کوالٹی کنٹرول اتھارٹی (Pakistan Standards and Quality Control Authority/PSQCA) کے باہمی تعاون سے جاری ہے۔ اس کے علاوہ WFP (ڈبلیو ایف پی) بھی پاکستان میں دہشت گردی اور قدرتی آفات سے متاثرہ عوام (Internaly Displaced Persons/IDPs) کوفورٹیفائیڈ آٹا فراہم کررہا ہے۔

حکومت پاکستان نے ان جاری منصوبوں کو سہولت فراہم کرنے اور فروغ دینے کے لیے فنانس بل 17-2016 میں خوراک میں غذائیت بڑھانے والے اجزاء مائیکرو نیوٹرینٹس، نمکیات (minerals) کو درآمدی ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس سے مستثنی قرار دیا ہے تاکہ عوام کوفورٹیفائڈ آٹا کم قیمت پر فراہم ہوسکے۔ اس سے پہلے ان اشیاء پر ڈیوٹی کی شرح مجموعی طور پر 70 فیصد تھی،[6] یہ تمام مائیکرو نیوٹرنٹ یا مصنوعی غذائی اجزاء درآمد کیے جاتے ہیں۔

بائیو فورٹیفیکیشن

بائیو فورٹیفیکیشن ایک ایسا سائنسی عمل ہے جس میں جدید ٹیکنالوجی (ہائبرڈ، جینیاتی یا دیگر) کے ذریعے فصلوں میں غذائیت بڑھانے یا فصل کے غذائی معیار میں اضافہ کیا جاتا ہے۔[7] مثلاً گندم کے بیج کی ایسی قسم تیار کرنا جس میں زنک کی مقدار ہائبرڈ اور زیادہ پیداوار دینے والی گندم کی اقسام کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے تاکہ عوام میں زنک کی کمی کو دور کیا جاسکے۔

پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں کنسلٹیٹو گروپ آن انٹرنیشنل

ایگریکلچرل ریسرچ (Consultative Group on International Agricultural Research/CGIAR) یو کے ایڈ، بل اینڈ ملنڈا گیٹس فاونڈیشن، دی یو ایس گورنمنٹ گلوبل ہنگر اینڈ فوڈ سیکیورٹی انیشیٹو اور یورپی کمیشن خوراک میں غذائیت کی کمی اور بھوک کے خلاف کام میں مصروف عمل ہیں۔ انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (IFPRI) اور انٹرنیشنل سینٹر فار ٹراپیکل ایگری کلچر (International Centre for Tropical Agriculture/CIAT) کی تحقیقی معاونت سے ہارویسٹ پلس (HarvestPlus) پروگرام کے تحت پاکستان میں زنک کی حامل گندم کو فروغ دینے کا منصوبہ جاری ہے۔ اس منصوبے کے تحت پاکستان کے زرعی تحقیق اداروں خصوصاً بیج تیار کرنے والے نجی اور سرکاری اداروں کے ساتھ کام جاری ہے اور گزشتہ سال زنک کی حامل گندم کی ایک قسم زنکول 2015 متعارف کروائی گئی اور اسی سال ادارہ ہارویسٹ پلس پروگرام کے ساتھ جڑے بیج کی پیداوار کرنے والے مقامی اداروں اور کسانوں کے ذریعے زنکول 2015 کی افزائش کررہا ہے۔[8] ادارے کا دعوی ہے کہ گندم کی یہ قسم زنک کی یومیہ ضرورت کا پچاس فیصد فراہم کرتی ہے۔ زیادہ پیداوار دیتی ہے اور بیماریوں کے خلاف مزاحمت کی حامل ہے۔ ہارویسٹ پلس پاکستان ایگری کلچرل ریسرچ سینٹر (پارک) اور نیشنل ایگریکلچرل ریسرچ کونسل (نارک) کو زنک کی حامل گندم کی مزید اقسام تیار کرنے میں مدد بھی فراہم کررہا ہے۔[9]

تجزیہ

حکومت پاکستان کی موجودہ زرعی پالیسیاں ایک طرف ملک میں موجود اضافی پیداوار کو برآمد کرنے اور پیداوار میں اضافے پر مرکوز نظر آتی ہیں اور دوسری طرف بھوک اور غذائی کمی پر قابو پانے کے لیے فوڈ فورٹیفیکیشن اور بائیوفورٹیفیکیشن ٹیکنالوجی درآمد کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے حالانکہ برآمد پر دی جانے والی زرتلافی کسانوں اور صارفین کو فراہم کرکے بھوک اور غذائی کمی پر کافی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

زرعی زرتلافی

حکومت کی جانب سے برآمدات پر بھاری زرتلافی دیے جانے کی دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ایک چینی جسے برآمد کرنے کے لیے حکومت گزشتہ سالوں بھاری زرتلافی دیتی رہی ہے اور دوسری گندم جس کی برآمد پر لگ بھگ ایک سال سے بھاری زرتلافی دیئے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔

زرتلافی دینے کا آغاز گندم کی خریداری سے شروع ہوجاتا ہے جس کا مقصد غریب کسانوں کو گندم کی امدادی قیمت دے کر پیداواری لاگت میں اضافے کے اثرات سے بچانا ہوتا ہے، گو کہ یہ اقدام کسان کو کسی طور سہولت پہنچاتا ہے لیکن باردانے کی تقسیم میں بدعنوانی اور اقربا پروری چھوٹے کسانوں کی حق تلفی کا سبب بنتی ہے۔ یہ زرتلافی بھی زیادہ تر بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور تاجروں کی جیب میں ہی چلی جاتی ہے کیونکہ حکومت کل گندم کی پیداوار کا زیادہ سے زیادہ 30 فیصد حصہ ہی کسانوں سے خریدتی ہے۔ اس صورتحال میں زیادہ تر کسان گندم کھلی منڈی میں ہی فروخت کرتے ہیں جس کی قیمت پچھلے سالوں میں گندم کی کٹائی کے موسم میں تقریباً 1,100 روپے فی من دیکھی گئی ہے۔

گندم کا برآمد کنندگان تاجر مقامی منڈی سے 1,100 روپے فی من کے حساب سے گندم خریدتا ہے یعنی تاجر کو ایک ٹن گندم 27,500 روپے (275 ڈالر) میں ملتی ہے جس پر حکومت تاجر کو گندم برآمد کرنے کے لیے 12,000 روپے (120 ڈالر) زرتلافی ادا کرتی ہے۔ زرتلافی ملنے کے بعد تاجر کو یہی منڈی سے خریدی گئی ایک ٹن گندم 15,500 روپے (155 ڈالر) میں پڑتی ہے جسے وہ عالمی منڈی میں 17,000 روپے (170 ڈالر) میں فروخت کرسکتا ہے۔ اس طرح تاجر بھرپور حکومتی مراعات کا فائدہ اٹھا کے ایک ٹن گندم برآمد کرکے 1,500 روپے (15 ڈالر) منافع کماتا ہے جس میں سے تاجر کو صرف نقل وحمل کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی تاجر چند دنوں میں بغیر کسی سخت محنت کے گندم برآمد کرکے بھاری منافع کماتے ہیں اس کے برعکس حکومت کل کسان طبقے میں سے 30 فیصد کو ایک ٹن گندم پر صرف 5,000 روپے (50 ڈالر) زرتلافی دیتی ہے جو فصل کی بوائی سے کٹائی کے دوران چھ ماہ سخت محنت کرتا ہے۔ سندھ کے ضلع گھوٹکی میں پاکستان کسان مزدور تحریک کے کسانوں سے ایک ایکڑ زمین پر گندم کی کاشت پر آنے والے اخراجات اور پیداوار سے متعلق حاصل کردہ معلومات کے مطابق کسان تمام اخراجات کے بعد فی ایکڑ زیادہ سے زیادہ 24,000 روپے آمدنی حاصل کرتا اگر فی ایکڑ پیداور 1.4 ٹن (35 من) حاصل ہو۔ (حالانکہ حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے اقتصادی سروے 16-2015 میں فی ایکڑ پیداوار ایک ٹن [25 من] ظاہر کی گئی ہے)۔

زرتلافی دینے کی یہ حکومتی پالیسی سراسر سرمایہ دار دوست پالیسی ہے جس سے نہ صرف گندم کے برآمد کنندگان بلکہ کیمیائی کھاد تیار کرنے والے کارخانے اور درآمد کنندگان نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ گزشتہ سال حکومت نے کسانوں کو پیداواری لاگت میں اضافے کے اثرات سے تحفظ فراہم کرنے کے نام پر سرکاری خزانے سے کیمیائی کھادوں پر بھی زرتلافی فراہم کی جس کے نتیجے میں ڈی اے پی اور یوریا کی 50 کلو کی بوری پر بلترتیب 500 اور 300 روپے کمی کی گئی، قیمت میں اس کمی کا ایک ایکڑ زمین پر گندم کاشت کرنے والے کسان کو زیادہ سے زیادہ 1,100 روپے کا فائدہ پہنچا (کسان عموماً ایک بوری ڈی اے پی اور دو بوری یوریا ایک ایکڑ پر استعمال کرتے ہیں)۔ یہاں یہ نکتہ بھی نہایت اہم

ہے کہ دراصل یہ فائدہ صرف بڑے زمینداروں نے ہی حاصل کیا کیونکہ چھوٹے کسان تو اکثر نقد پر زرعی مداخل خرید ہی نہیں پاتے اور فصل کٹنے کے بعد بمع سود ان مداخل کی کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ان حکومتی مراعات سے کھاد بنانے والی صنعت نے فائدہ اٹھایا۔

حکومت کی جانب سے کھاد پر زرتلافی دیے جانے سے کھاد کے استعمال میں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں کھاد کمپنیوں کی پیداوار میں سال 2015-16 میں 14.4 فیصد اضافہ ہوا[10] جبکہ سال 2014-15 میں اس اضافے کی شرح صرف 0.2 فیصد تھی[11] یعنی زرتلافی کے نتیجے میں کھاد کی فروخت میں بے تحاشہ اضافہ ہوا جو کھاد کمپنیوں کے منافع میں اضافے کا سبب بنا۔ مثلاً صرف اینگرو فرٹیلائزر کی سال 2016 کی تیسری سہ ماہی میں ڈی اے پی کی فروخت تقریباً چار گنا بڑھ کر 111,000 ٹن ہوگئی جو گزشتہ سال اسی مدت میں 32,000 ٹن تھی۔[12] یعنی یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ سرکاری خزانے سے دی جانے والی اس زرتلافی سے چھوٹے کسان کو فائدہ ہو نہ ہو کھاد کمپنیوں اور برآمد کنندگان کے نفع میں اضافہ جاری ہے اور دی جانے والی تمام تر زرتلافی کا مقصد اس صورتحال میں ایک ہی نظر آتا ہے کہ گندم صرف اس لیے برآمد کی جائے کہ حکومتی ذخائر فروخت کرکے زرمبادلہ حاصل کیا جائے اور مقامی منڈی میں گندم کی قیمت میں کمی کو روکا جاسکے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں عوام کو گندم آج بھی انہی نرخوں پر مل رہی ہے لیکن عوامی خزانے سے دنیا کے ان ممالک کو سستی گندم بہم پہنچائی جارہی ہے جو گندم نہیں اگاتے اور درآمد پر انحصار کرتے ہیں۔ یعنی پاکستانی عوام کے ٹیکسوں سے حاصل شدہ سرمائے سے بین الاقوامی تاجروں کو سستی گندم فراہم کی جارہی ہے۔ یہ ایک طرح کا زمینی قبضہ اور کارپوریٹ زراعت ہی ہے جس میں ہماری زمین، پانی اور افرادی قوت دیگر ممالک کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کی جائے جبکہ خود ملکی عوام ان وسائل سے استفادہ کرنے سے محروم کردی گئی ہے جس کی اکثریت کے پاس زمین جیسے پیداواری وسائل نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک میں آدھی آبادی غربت اور غذائی کمی کی شکار ہے۔ گندم کی برآمد کے لیے تاجروں کو زرتلافی دینے کے بجائے اگر حکومت کسان کو زرتلافی دیدے تو ملک میں گندم کی قیمت موجودہ قیمت سے آدھی ہوسکتی ہے جس سے ملک میں بھوک اور غذائی کمی کو کسی حد تک کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور اس طرح چھوٹے پیداواری طبقے اور مزدور صارف آبادیاں دونوں ہی فائدہ حاصل کرسکتی ہیں۔

غذائی کمی

پاکستان میں غذائی کمی کی ایک بنیادی وجہ خود حکومت اور بین الاقوامی امدادی اداروں کے تعاون سے چلنے والے تحقیقی اداروں کی جانب سے بتائی جاتی ہے کہ موجودہ خوراک میں انسانی ضرورت کے مطابق غذائیت موجود نہیں جس کی وجہ سے عوام میں بڑے پیمانے پر خصوصاً بچوں میں غذائی کمی پائی جاتی ہے جبکہ سبز انقلاب کے ذریعے ان ہی اداروں اور سرمایہ دار ممالک کے ذریعے ہی ایسے ہائبرڈ بیج اور مشینی طریقہ زراعت متعارف کروایا گیا تھا جسے پچاس سال سے زائد عرصہ ہوچکا ہے لیکن ملک میں نہ تو بھوک ختم ہوئی نہ غربت ہاں البتہ سبز انقلاب کے تحت

گلوبل الائنس فار امپروڈ نیوٹریشن

گلوبل الائنس فار امپروڈ نیوٹریشن (GAIN) ایک عالمی تنظیم ہے جو انسانی آبادیوں میں غذائی کمی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے قوام متحدہ میں 2002 میں قائم کی گئی۔ ادارے کا ہدف ہے کہ دنیا کو غذائی کمی سے پاک کیا جائے۔ GAIN (گین) کے تحت 2013 میں ایک تحقیقی پلیٹ فارم تشکیل دیا گیا۔ جس کا نام بزنس پلیٹ فارم فار نیوٹریشن ریسرچ ہے۔ اس پلیٹ فارم میں اجینو موٹو (Ajinomoto)، بیسف (BASF)، گلیکسو سمیتھ کلن (GlaxoSmithKline)، پیپسکو اور یونی لیور جیسی دیوہیکل بین الاقوامی کمپنیاں شامل ہیں۔ پلیٹ فارم کا مقصد ہے کہ غذائیت کے کاروبار کو کس طرح فروغ دیا جائے کہ دونوں نجی اور سرکاری شعبوں کو فائدہ پہنچے۔ گین اس تحقیقی پلیٹ فارم کا سیکریٹریٹ ہے۔ گین دنیا کے کئی ممالک میں اپنے شراکت داروں کے ساتھ کام کرتا ہے جن میں قومی حکومتیں، سماجی یا غیر سرکاری تنظیمیں، تعلیمی ادارے، مقامی اور بین الاقوامی نجی شعبے کی کمپنیاں شامل ہیں۔ گین سے 600 سے زائد نجی کمپنیاں جڑی ہوئی ہیں جن میں کوکا کولا، مارس اور بچوں کی غذا بنانے والی دوسری بڑی کمپنی دانون (Danone) بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ عالمی غذائی پروگرام اور بچوں کی بہبود کے عالمی ادارے یونائیٹڈ نیشنز چلڈرنز فنڈ یونیسیف بھی گین کے اہم شراکت دار ہیں۔ ادارہ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے امدادی اداروں کی مدد سے دنیا بھر میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ ان امداد دینے والے اداروں میں یو ایس ایڈ، یو کے ایڈ اور فرانس کا امدادی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی اور بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن جیسے ادارے شامل ہیں۔ گین کے اہداف میں شامل ہے کہ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ جس سے زراعت اور غذائیت میں سرمایہ کاری کے ذریعے مناسب قیمت میں غذائیت سے بھرپور متنوع خوراک کی فراہمی بہتر ہو۔ گین دنیا میں فوڈ فورٹیفیکیشن کے لیے بڑے پیمانے پر کام کرتا ہے اور دنیا کے 30 ممالک میں 800 ملین افراد کو فورٹیفائڈ خوراک فراہم کرنے کے لیے خوردنی تیل میں وٹامن اے اور وٹامن ڈی، گندم اور مکئی کے آٹے میں فولاد، فولک ایسڈ، وٹامن بی اور زنک شامل کرنے میں مدد فراہم کررہا ہے۔ یہ سہولت خوراک میں شامل کیے جانے والے مصنوعی غذائی اجزاء کی خریداری کا ایک ایسا مرکزی نظام ہے جہاں سے خوراک تیار کرنے والے ادارے یا کمپنیاں وٹامن، نمکیات اور دیگر اجزاء خرید سکتے ہیں۔ ادارہ اس سہولت کی دنیا بھر کی خوراک تیار کرنے والی صنعتوں، ورلڈ فوڈ پروگرام جیسی عالمی تنظیموں اور حکومتوں کو پیشکش کرتا ہے کہ وہ گین کے تجویز کردہ مستند ترسیلی اداروں سے طویل مدت معاہدے کرسکتے ہیں جس سے ان اجزاء کی قیمت میں 20 فیصد تک کمی ممکن ہے۔ گین کے حوالے سے اوپر بیان کردہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ یہ ادارہ بھوک کے شکار افراد کے لیے غذائیت سے بھرپور خوراک کے نام پر دیوہیکل کمپنیوں کے لیے منڈی فراہم کرتا ہے۔

متعارف کروائی گئی ٹیکنالوجی سے پیداواری لاگت میں اضافہ ضرور ہوا جس نے کسانوں کو نہ صرف کمپنیوں کا محتاج بنایا بلکہ ان کی آمدنی میں بیج، کھاد اور زرعی ادویات پر ہونے والے اخراجات کی وجہ سے واضح کمی آئی جو عوام میں غذائی کمی اور بھوک میں اضافے کی وجہ بنی۔ اس کے علاوہ بھوک اور غذائی کمی میں اضافے کی ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ سبز انقلاب کے تحت متعارف کروائے گئے بیجوں نے کسانوں کی جانب سے روایتی طور پر اگائی جانے والی غذائیت سے بھرپور متنوع اقسام کی فصلوں پر مشتمل خوراک کے نظام کو کمزور کردیا۔ گزشتہ پچاس سالوں میں ترقی پزیر ممالک میں مخصوص اقسام کے اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور خوراک ان مخصوص اقسام کے اجناس تک ہی محدود ہوگئی، نتیجے میں ہمارا پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن ہمارا جسم بہت سے لازمی غذائی اجزاء یعنی مائیکرو نیوٹرنٹ اور وٹامنز کی کمی کا شکار ہوجاتا ہے۔[13]

سبز انقلاب کے ذریعے پہلے غربت، بھوک اور غذائی کمی میں اضافہ کرکے اب اس کا حل بھی سرمایہ دار کمپنیاں منافع کے حصول کے لیے ہی پیش کررہی ہیں اور اب ان بیجوں کو رد کیا جارہا ہے جس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک جینیاتی بیج کو فروغ دیا جائے جو کسان کو کمپنیوں کے بیج اور دیگر مداخل کا محتاج بنا کر خود غربت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ دوسری وجہ موجودہ خوراک میں بائیو فورٹیفیکیشن اور فوڈ فورٹیفیکیشن کے ذریعے مصنوعی غذائیت شامل کی جائے جس کی ٹیکنالوجی صرف بڑے سرمایہ دار ممالک کے پاس ہے۔ دنیا میں اجناس کی تجارت کرنے والی بین الاقوامی کمپنی کارگل پاکستان میں برطانوی اور امریکی امدادی اداروں کی مدد سے آٹا اور گھی ملوں کو یہ ٹیکنالوجی فروخت کررہی ہے اور حکومت ان درآمدی اجزاء پر سرکاری خزانے سے محصول میں چھوٹ دے کر ان کمپنیوں کی منافع خوری میں بھرپور معاونت کررہی ہے۔

گندم جیسی اہم غذائی فصل میں بائیوفارٹیفکشن ممکن ہے کہ غذائی کمی کے شکار افراد میں زنک کی ضروریات پوری کرنے کا سبب بنے لیکن گندم کی اس قسم کا فروغ دیگر اقسام کی کاشت میں کمی اور ان کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ وہ کسان بھی جو اپنا محفوظ کردہ گندم کا بیج کاشت کرتے ہیں اس نئی قسم کے فروغ سے بیج خریدنے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ کمپنیوں کے پیش کردہ بیج، کسان کے بیج پر ملکیتی حقوق پر ایک اور ضرب ہے اور خوراک و زراعت پر کمپنیوں کی اجارہ داری مزید مستحکم کرنے کا ایک اور زریعہ۔ اس کے علاوہ گندم کی اس قسم کے بڑے پیمانے پر کاشت کے کیا اثرات پیداوار اور زمین پر آئیں گے یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے۔ زرعی شعبہ اس وقت بی ٹی کپاس پر بیماریوں کے حملے سے کم پیداوار کے نتیجے اربوں روپے کے نقصان سے دوچار ہوچکا ہے جبکہ کپاس کے کاشتکار شدید مالی نقصان سے دوچار ہیں۔

ملک سے بھوک، غربت اور غذائی کمی صرف اور صرف پیداواری وسائل کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے ہی ختم کی جاسکتی ہے اور کسان کی خوشحالی بھی زمین کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کے نتیجے میں ہی ہوسکتی ہے۔ امداد، زرتلافی، جدید ٹیکنالوجی کسان کے پائیدار خوراک کے پیدائشی حق کا متبادل کسی طور نہیں ہوسکتی۔

حوالہ جات

1. Index Mundi. "Pakistan wheat domestic consumption by year." Index Mundi, 2017. Accessed from https://www.indexmundi.com/agriculture/?country=pk&commodity=wheat&graph=domestic-consumption
2. The Express Tribune. "Jordan declines to purchase Pakistani wheat." The Express Tribune, September 8, 2016. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1178231/jordan-declines-purchase-pakistani-wheat/
3. Abbasi, Kashif. "Two out of every three households cannot afford proper diet." Dawn, July 15, 2016. Accessed from https://www.dawn.com/news/1270924
4. Clarke, Renata. "Micronutrient fortification of food: technology and quality control." FAO Corporate Document Repository, Food and Agriculture Organization of the United Nations, Rome, 1996. Accessed fromhttp://www.fao.org/docrep/W2840E/w2840e0b.htm
5. British High Commission Islamabad and DFID Pakistan. "New Food Fortification Programme to help tackle malnutrition in Pakistan." British High Commission Islamabad and DFID Pakistan, September 9, 2016. Accessed from https://www.gov.uk/government/world-location-news/new-food-fortification-programme-to-help-tackle-malnutrition-in-pakistan
6. Global Alliance for Improved Nutrition (GAIN). "How tax cuts in Pakistan will give more people access to nutritious foods." GAIN. Accessed fromhttp://www.gainhealth.org/knowledge-centre/tax-cuts-pakistan/
7. e-Library of Evidence for Nutrition Actions (eLENA). "Biofortification of staple crops." World Health Organization (WHO), 2017. Accessed fromhttp://www.who.int/elena/titles/biofortification/en/
8. Ahmed, Amin. "Zinc-rich wheat variety to be cultivated this year." Dawn, August 18, 2015. Accessed fromhttps://www.dawn.com/news/1201092
9. HarvestPlus. "Pakistan." HarvestPlus, 2017. Accessed from http://www.harvestplus.org/where-we-work/pakistan
10. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2015-16." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2012, p.31. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_16/02_Agriculture.pdf
11. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2012, p.31. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
12. The Express Tribune. "Engro Fertilizers makes Rs 2.9b profit in Q3." The Express Tribune, October 26, 2016. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1210230/engro-fertilizers-makes-rs2-9b-profit-q3/
13. Daño, Elenita C. "Biofortification: Trojan horse of corporate food control?" Development, 2014, Volume 57, Number 2, Page 201. Accessed from https://link.springer.com/article/10.1057/dev.2014.82

بی ٹی کپاس کی پیداوار: ایک سراب!

تحریر: امام الدین سومرو

پاکستان ایک زرعی ملک ہے جس کی تقریباً 70 فیصد آبادی زراعت سے وابستہ ہے۔[1] پاکستان وسیع زرعی وسائل اور مختلف ماحولیاتی اور موسمی زون یا علاقوں سے مالا مال ہے جو خوراک اور کئی نقد آور فصلوں کی اقسام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی نظام ہے لیکن پانی کی یکساں تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے جنوبی حصے خشکی کا شکار رہتے ہیں۔ پاکستان دنیا میں کپاس پیدا کرنے والا چوتھا بڑا ملک ہے۔[2] کپاس ایک نقد آور فصل ہے جسے سفید سونا بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں میں کپاس اگائی جاتی ہے۔ سندھ میں کپاس کی فصل اپریل سے جون اور پنجاب میں مئی سے جولائی تک کاشت کی جاتی ہے 15 اکتوبر سے ماہ دسمبر تک ختم ہو جاتی ہے۔[3] پنجاب سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق رحیم یار خان، ویہاڑی، ملتان، لودھراں، مظفر گڑھ، لیہ، ڈیرہ غازی خان، راجن پور، ساہیوال، پاکپتن اور اوکاڑہ میں زیادہ تر کپاس کاشت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سندھ میں سانگھڑ، نوابشاہ، دادو، خیرپور، سکھر اور گھوٹکی اضلاع بھی کپاس کے پیداواری علاقوں میں شامل ہیں۔[4]

کپاس کی فصل سے قومی زرعی آمدنی میں جی ڈی پی تقریباً 1.0 فیصد ہے۔ مجموعی زرعی پیداوار میں کپاس کا حصہ 5.1 فیصد ہے۔ حکومت پاکستان کی رپورٹ کے مطابق 2016-2015 میں کپاس کی پیداوار میں 27.8 فیصد کمی ہوئی۔ 2016 میں کپاس کی فصل پر گلابی سنڈی کے شدید حملے کی وجہ سے کپاس اگانے والے کسانوں کو بڑے پیمانے پر نقصان ہوا۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال کپاس کی فصل کے ابتدائی دنوں میں شدید بارشوں کی وجہ سے بیج کی بوائی میں بھی مسائل پیدا ہوئے تھے۔ حکومت پاکستان کے مطابق کپاس کی فصل کے ابتدائی دنوں میں شدید بارشوں سے ہونے والے نقصان کی وجہ سے کسانوں نے کھاد اور زہریلے اسپرے کا استعمال کم کیا جس سے کپاس کی پیداوار میں کمی ہوئی۔ گزشتہ سالوں میں 7,316.79 ایکڑ پر کپاس کی فصل لگائی جاتی تھی جبکہ 16-2015 میں کپاس کی فصل 7,208.064 ایکڑ پر لگائی گئی یعنی تقریباً 1.5 فیصد کی کمی ہوئی۔[5]

پاکستان کسان مزدور تحریک نے 2016 میں صوبہ سندھ اور پنجاب میں کچھ کسانوں سے کپاس کی پیداوار سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ سندھ میں ضلع ٹنڈو محمد خان، ضلع خیرپور اور ضلع گھوٹکی کے 17 کسانوں سے، پنجاب کے اضلاع میں ملتان، ساہیوال، پاکپتن اور اوکاڑہ کے 22 کسانوں سے کپاس کی پیداوار پر کیے گئے اخراجات کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔

ایک ایکڑ سے 12 ایکڑ تک زمین رکھنے والے چھوٹے اور بے زمین کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق سندھ میں 17 کسانوں نے کپاس کی فصل پر 28,000 سے 70,000 روپے فی ایکڑ خرچ کیے اور فی ایکڑ آمدنی 14,000 سے 58,500 ہزار روپے حاصل ہوئی (جدول1)۔

جدول 1

سندھ میں کپاس پر اخراجات اور آمدنی

کسان	کل خرچ فی ایکڑ (روپے)	کل آمدنی فی ایکڑ (روپے)	ماہانہ آمدنی (روپے)
1	45,400	14,600	2,433.3
2	28,060	22,340	3,723.3
3	35,600	24,400	4,066.7
4	31,100	24,900	4,150.0
5	34,700	26,900	4,483.3
6	36,950	27,450	4,575.0
7	32,000	28,000	4,666.7
8	60,800	29,200	4,866.7
9	40,100	29,900	4,983.3
10	28,700	30,100	5,016.7
11	62,300	30,100	5,016.7
12	29,500	31,400	5,233.3
13	36,900	33,100	5,516.7
14	35,750	34,250	5,708.3
15	59,230	47,170	7,861.7
16	70,000	50,000	8,333.3
17	61,500	58,500	9,750.0
کل کسان	اوسط خرچہ فی ایکڑ	اوسط آمدنی فی ایکڑ	اوسط ماہانہ آمدنی
17	42,858	31,900	5,320

پنجاب میں 22 کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کپاس کی فی ایکڑ کاشت پر فصل پر کیے گئے اخراجات 22,500 روپے سے 52,700 روپے تھے جبکہ آمدنی 4,200 سے 43,500 روپے فی ایکڑ حاصل ہوئی (جدول2)۔ چار کسانوں کو ماہانہ 1,000 روپے سے 2,000 روپے کا نقصان ہوا۔

جدول 2

پنجاب میں کپاس پر اخراجات اور آمدنی

کسان	کل خرچ فی ایکڑ (روپے)	کل آمدنی فی ایکڑ (روپے)	ماہانہ آمدنی (روپے)
1	48,160	-11,410	-1,901.7
2	47,660	-8,660	-1,443.3
3	40,155	-3,755	-625.8
4	37,800	4,200	700.0
5	48,700	7,300	1,216.7
6	27,450	10,050	1,675.0
7	52,120	10,880	1,813.3
8	25,800	12,000	2,000.0
9	52,740	13,260	2,210.0
10	45,500	16,600	2,766.7
11	52,620	16,680	2,780.0
12	40,400	18,400	3,066.7
13	40,400	18,400	3,066.7
14	37,000	19,000	3,166.7
15	37,500	20,000	3,333.3
16	25,300	23,300	3,883.3
1 7	46,100	23,900	3,983.3
18	46,800	28,600	4,766.7
19	39,000	30,000	5,000.0
20	41,500	39,700	6,616.7
21	36,900	41,100	6,850.0
22	22,500	43,500	7,250.0
کل کسان	اوسط خرچہ فی ایکڑ	اوسط آمدنی فی ایکڑ	اوسط ماہانہ آمدنی
22	40,550	16,465	2,867

سندھ کے 17 کسانوں اور پنجاب کے 22 کسانوں سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی اعداد و شمار کے سندھ میں 70.6 فیصد کسان کپاس کی فصل سے صرف چار ہزار سے چھ ہزار روپے ماہانہ کما پاتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس پنجاب میں صرف 13.3 فیصد کسان اتنی آمدنی حاصل کر پا رہے ہیں (جدول 3)۔

سندھ اور پنجاب میں کپاس پر کیڑوں کے حملے اور بیماریوں کی وجہ سے ہر سال پیداوار میں کمی پائی جاتی ہے۔ 2016 میں پنجاب میں گلابی سنڈی اور سندھ میں سفید مکھی اور ملی بگ کا حملہ زیادہ ہوا۔ دونوں صوبوں کے کسانوں نے بتایا کے بارشوں کی وجہ سے کپاس کے پودے کو شدید نقصان ہوا اس لیے ان کی فصل اتنی اچھی نہیں ہوئی۔ کسانوں کے مطابق سندھ میں بھی کپاس پر پچھلے سالوں کے مقابلے میں 2016 میں بیماریوں کا حملہ زیادہ تھا جو ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔

جدول 3

کپاس کی فصل سے سندھ اور پنجاب کے کسانوں کی ماہانہ آمدنی

ماہانہ آمدنی (روپے)	سندھ کل کسان	سندھ ماہانہ آمدنی فیصد	پنجاب کل کسان	پنجاب ماہانہ آمدنی فیصد	ماہانہ آمدنی مجموعی فیصد
2000-3000	1	5.8	7	31.8	20.5
3001-4000	1	5.8	6	27.2	17.9
4001-6000	12	70.6	2	9.1	35.9
6001-8000	1	5.9	3	13.3	10.2
8001-10,000	2	11.8	-	-	5.1
ماہانہ نقصان	-	-	*4	18.2	10.3
کل کسان	17		22		39

*ایک کسان کی ماہانہ آمدنی 700 روپے حاصل ہوئی۔ اس کو بھی نقصان اٹھانے والے کسانوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔

سندھ میں زیادہ تر ملی بگ، سفید مکھی، لشکری سنڈی، گلابی سنڈی اور امریکن سنڈی کا حملہ تھا، جب کے تھرپس اور وائیرس کا بھی حملہ تھا۔ ان سب بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے زہریلے اسپرے کا استعمال زیادہ ہوا۔ سندھ کے کسانوں کے مطابق زیادہ اسپرے کرنے کے باوجود بھی کیڑے ختم نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ مہنگے زہریلے مواد کے بڑھتے ہوئے خرچ کی وجہ سے کسان مزید قرض میں دب کر رہ گئے تھے۔

پنجاب کے 14 کسانوں نے کہا کے پچھلے سالوں کے مقابلے میں 2016 میں کپاس پر زیادہ کیڑوں اور بیماریوں کا حملہ ہوا۔ پنجاب میں زیادہ تر بیماریوں میں سبز تیلا، گلابی سنڈی، سفید مکھی، لشکری سنڈی اور امریکن سنڈی کا حملہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ چٹ کبری سنڈی، ملی بگ، وائیرس اور مختلف بیماریوں کا حملہ بھی تھا۔ ان سب بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے مختلف کمپنیوں کے زہریلے مواد کو زیادہ استعمال کیا جا رہا تھا۔

اس رپورٹ میں شامل کسانوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق سندھ میں کپاس کی پیداوار فی ایکڑ 18 سے 40 من ہوئی جبکہ اوسطاً پیداوار 37 من فی ایکڑ ہوئی۔ پنجاب میں کپاس کی پیداوار فی ایکڑ 13 سے 30 من ہوئی۔ اوسطاً پیداوار 25 من فی ایکڑ ہوئی۔

پنجاب میں خصوصاً گلابی سنڈی کی وجہ سے کپاس کی فصل پر زیادہ اخراجات اور پیداوار میں کمی نظر آئی۔ 2016 میں جبکہ سندھ میں کپاس فی من کی قیمت 2,800 سے 3,000 روپے تھی۔ پنجاب میں کپاس کی فی من کی قیمت 2,700 سے 2,800 روپے تھی۔

سندھ میں زیادہ تر بی ٹی کپاس لگائی گئی تھی لیکن ضلع خیر پور کے کچھ علاقوں میں کچھ کسانوں نے بتایا کے ان کے پاس مروجہ بیج تھا جو انہوں نے

استعمال کیا تھا۔ کپاس کے بیج کے حوالے سے پنجاب میں 22 کسانوں میں سے کسی کے پاس بھی کپاس کا بیج اپنا نہیں تھا۔ کسان ہر سال منڈی سے کمپنی کا بیج خریدتے ہیں۔ کسانوں نے کہا کے پہلے بیج ہمارے پاس اپنے تھے جب سے کمپنی اور ہائیبرڈ بیج منڈی میں آیا اس کے بعد آہستہ آہستہ سارے بیج ختم ہوتے گئے اور آج ہمارے پاس کپاس کا کوئی بیج اپنا نہیں رہا۔

کپاس کی فصل کے حوالے سے کسانوں نے کہا کہ زیادہ اخراجات ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ بھی آمدنی حاصل نہیں ہوتی۔ کپاس کی فصل سے بیماری میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ''اگر ہمارے گھر میں کوئی بیمار پڑ جاتا ہے تو ہم اس کا علاج اچھے ہسپتال میں نہیں کروا سکتے کیونکہ ہمارے پاس گھر میں خوراک بھی پوری نہیں ہوتی تو اتنے پیسے کہاں سے لائیں گے۔ اس لیے گاؤں میں زیادہ تر لوگ بیماری کی وجہ سے فوت ہو جاتے ہیں۔'' مقامی کسانوں سے بات چیت کے دوران یہ بات واضح تھی کہ حکومت کپاس کی فصل لگانے پر زور دے رہی ہے کیونکہ کپاس کی فصل سے زرمبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

سندھ میں خیر پور اور گھوٹکی کے کسانوں کے مطابق حکومت نے گزشتہ تین سالوں سے چاول کی فصل پر پابندی عائد کی ہوئی ہے جو اگلے دو سالوں تک جاری رہے گی۔ پابندی لگانے کی وجہ چاول کی فصلوں میں زیادہ پانی کے استعمال سے خیر پور اور گھوٹکی ضلع کی زمینوں کا خراب ہونا بتائی گئی ہے۔ کسانوں کا کہنا تھا کہ وہ اب مجبوری میں کپاس لگاتے ہیں جس سے انہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہورہا۔ چاول کی فصل سے اگر زمین خراب ہورہی ہے تو حکومت گنا اور کپاس کی فصل لگانے پر کیوں زور دے رہی ہے؟ کیوں کے گنا اور کپاس کی فصل میں بھی زیادہ پانی کا استعمال ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان کی ایکانومک سروے آف پاکستان 2015-16 کے مطابق کھاد اور زہر وغیرہ کے کم استعمال سے کپاس کی پیداوار میں کمی ہوئی۔ کسانوں نے زہر اور کھاد کا استعمال اس لیے نہیں کیا کیونکہ سخت بارشوں کی وجہ سے فصل پہلے سے تباہ ہوچکی تھی۔ جبکہ کسان کہتے ہیں کہ زیادہ کھاد اور زہر ڈالنے سے اخراجات میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے وہ مزید مقروض ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حکومت کا یہ بیان وزن نہیں رکھتا۔6

تجزیہ

چھ ماہ کی فصل سے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو کیا فائدہ ہوا صاف ظاہر ہے کہ دن رات ایک کرکے کسان فصل کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی کسان کام کو پورا کرتا ہے۔ پہلے کسانوں کے پاس چاول اپنے ہوتے تھے جو وہ خوراک کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اب وہ منڈی سے مہنگے چاول نہیں خرید سکتے۔ کسانوں کو غذائی فصلوں سے محروم کرکے نقد آور فصلیں لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ملکی ترقی کے لیے دن رات محنت کرنے والے کسانوں کو حکومت پاکستان نے کیا دیا ہے؟ خوارک پیدا کرکے سب کو کھلانے والا کسان خود بھوکا رہتا ہے۔

کپاس کی فصل پر اسپرے اور کھاد وغیرہ ڈالنے سے کسان قرض میں مبتلا ہیں۔ بی ٹی کپاس کاشت کرنے کی وجہ سے آج ہمارے کسانوں کے پاس اپنا بیج بھی نہیں رہا اور کسان یوریا، ڈی اے پی، زرعی زہر اور بیج بنانے والی کمپنیوں کا محتاج ہو گیا ہے۔ اس زہریلے مواد سے انسانی بیماری بڑھتی جارہی ہے خصوصاً کسان اور کپاس کی چنائی کرنے والی زرعی مزدور عورتیں شدید تکلیف کا شکار ہیں۔ دوسری طرف زیادہ زہر اسپرے کرنے سے دوست کیڑے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ کپاس کی فصل ہمارے کسان کے لیے مشکل حالات پیدا کررہی ہیں۔ کسان ہر سال اس امید پر فصل لگاتے ہیں کہ اس سال پیداوار اچھی ہوگی اور وہ خوشحال ہوں گے پر کئی سالوں سے کسان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ سرکاری نوکری کرنے والوں کے لیے ہر سال تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے پر کبھی کسانوں کے لیے بھی ایسا دن آئے کہ فصل میں بیماری اور پیداوار میں کمی کی وجہ سے حکومت ان کے قرض معاف کرے ان کے لیے براہ راست مراعات فراہم کرے، کھانے کے لیے خوراک فراہم کرے پر ایسا نصیب کسانوں کا کہاں! یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ کسانوں کو خوراک کی فصلوں سے محروم کیا جارہا ہے اور نقد آور فصلیں زیادہ سے زیادہ لگائی جارہی ہیں۔ خوراک ہر انسان کا حق ہے پر آج سب سے زیادہ بھوک کا شکار وہ ہی کسان ہے جو خود محنت کر کے خوراک پیدا کرتا ہے!

حوالہ جات

1- World Bank. "Rural population (% of total population)." World Bank. Accessed from http://data.worldbank.org/indicator/SP.RUR.TOTL.ZS?locations=PK

2. Cotton Australia. "World cotton market." Cotton Australia, 2016. Accessed from http://cottonaustralia.com.au/cotton-library/fact-sheets/cotton-fact-file-the-world-cotton-market

3. United States Department of Agriculture, Foreign Agricultural Services. "Pakistan cotton production forecast to recover from last season." Commodity Intelligence Report, USDA, March 1-2017. Accessed fromhttps://pecad.fas.usda.gov/highlights/2017/03/

4. Directorate of Agriculture (Economics and Marketing) Punjab. "Cotton production, marketing and export. Publication No 04/2006." Directorate of Agriculture (Economics and Marketing) Punjab, 2006. Accessed from http://amis.pk/pdf/Pulications/CottonProductionMarketingAndExport.pdf

5. Finance Division, Government of Pakistan. "Economic survey of Pakistan 2015-16, Agriculture." Ministry of Finance, Government of Pakistan. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_16/02_Agriculture.pdf

6۔ اس مضمون کے لیے نومبر 2016 میں سندھ سے ٹنڈو محمد خان، خیر پور اور گھوٹکی جبکہ دسمبر 2016 میں پنجاب سے ملتان، ساہیوال، پاکپتن اور اوکاڑہ کے مقامی کسانوں سے معلومات حاصل کی گئیں۔

گھریلو کام کرنے والی مزدور عورت

تحریر: رابعہ وسیم

دنیا بھر میں اس وقت 63.34 ملین ملازم کام کررہے ہیں جبکہ پاکستان میں دنیا کی دسویں بڑی مزدور قوت موجود ہے۔[1] وزیر اعلی پنجاب نے مزدوروں کے عالمی دن پر کہا تھا کہ ''مزدور قومی معیشت میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان کی خوشحالی اور خود مختاری پائیدار ترقی کے اہداف حاصل کرنے کے لیے بہت اہم ہے۔''[2] اس سلسلے میں انہوں نے ملک میں مزدوروں کی فلاح کے لیے کاربند بہت سے منصوبوں کی وجہ سے مزدوروں کی خوشحال زندگی کا بھی ذکر کیا تھا لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارے ملک کا مزدور اتنا ہی خوشحال ہے تو مئی 2015 میں شائع ہونے والے 14-2013 لیبر سروے کے مطابق 60.10 ملین مزدور قوت میں سے 3.48 ملین بے روزگار کیوں ہیں؟ جبکہ برسر روزگار افرادی قوت میں بھی 43.5 فیصد زراعت سے وابسطہ ہیں جہاں اجرت کم اور جبری مشقت زیادہ ہے۔[3] پاکستان میں 75 فیصد لوگ کسان اور مزدور ہیں اور ان کی ایک بڑی تعداد کے پاس مشکل سے کھانے کو دو وقت کی روٹی ہے۔[4] غربت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر دس میں سے تین افراد یعنی تقریبا 59 ملین آبادی غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔[5]

تیسری دنیا کے ممالک میں بڑی تعداد میں ہونے والی ہجرت کے پس پردہ 1960 میں بھوک مٹانے کے نعرے کے ساتھ آنے والا سبز انقلاب ہے۔ جس نے زمینوں پر کام کرنے والی آبادیوں کو خوشحالی کے خواب دیکھا کر قدرتی طریقہ زراعت تبدیل کرکے مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات کے استعمال کی ترغیب دی۔ شروع شروع میں تو مفت میں ملنے والی یہ طریقہ زراعت تمام کسانوں کو بہت بھلی لگی۔ لیکن جلد ہی اس کے منفی نتائج سامنے آنے لگے۔ پانی کی کمی ہوگئی اور زمینیں بنجر ہونا شروع ہوگئیں۔ مفت میں ملنے والی مصنوعی خوشحالی اب قیمت کے عوض بکنے لگی اور چھوٹے کسان اور ہاری کے لیے گلے کا طوق بن گئی۔ 1970 میں پوری دنیا میں تیل کا بحران آیا، ساتھ ہی ساتھ مشینری کے استعمال میں بھی اضافہ ہوا اور زمینوں پر کام کرنے والے ہاری کی زندگی میں بھوک اور بے روزگاری بڑھی۔ زرعی شعبے میں کام کے محدود مواقعوں، رکازی ایندھن اور منافع کی ہوس میں رکازی ایندھن کے استعمال کے محتاج صنعتی طریقہ پیداوار کے بے تحاشہ فروغ سے انسان کے برپا کیے موسمی بحران سے ہونے والی خشک سالی اور سیلاب کی وجہ سے آمدنی کی سطح اور روزگار میں مزید کمی آئی جس کے نتیجے میں شہر میں مزدوری کرنے والوں کی تعداد میں بہت بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا۔[6]

1970 کی دھائی میں تیل کے بحران کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر ایک نہایت سخت مزدور دشمن پالیسی سازی جس کو اسٹرکچرل ایڈجسمنٹ کا نام دیا جاتا ہے کو زبردستی کئی تیسری دنیا کے ممالک پر نافض کیا گیا۔ بہت سے ممالک میں اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام (SAP)، زرعی شعبے کی تباہی اور اقتصادی بحرانوں کی وجہ سے عورتیں اور لڑکیاں گھریلو مزدور منڈی میں دھکیل دی گئی ہیں۔[7] پاکستان میں زراعت میں کام کرنے والی کل افرادی قوت 2009 سے 2010 میں 45 فیصد تھی جس میں 2012 سے 2013 تک 43.7 فیصد کمی آئی ہے۔[8] کسان بہتر روزگار کے لیے شہروں کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ 1980 کی دھائی کے بعد سے سرمایہ دارانہ نظام نے سیپ (SAP) کے زریعیکے تحت نیو لبرل پالیسی سازی کو بے تحاشا فروغ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے مہنگائی میں روز بروز ہوتے اضافے نے مزدور کے لیے ضروریات زندگی کو حاصل کرنا بہت مشکل کردیا۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان کے مطابق انتہائی بھوک اور مفلسی اور دیہی آبادی میں بنیادی سہولیات جیسے بجلی، پینے کا صاف پانی، صحت و صفائی اور تعلیم کی کمی بھی شہری آبادی میں اضافے کی چند اہم وجوہات میں شامل ہیں۔[9]

یہ دیہات سے نقل مکانی کرنے والے مہاجر مزدور افرادی قوت کا بڑا حصہ ہیں جو ملازمتی منڈی میں رسمی دائرے سے باہر موجود ہیں۔ یہ شہر میں چلنی والی بسوں، گاڑیوں اور رکشے ڈرائیور، لوڈرز، گاڑیوں کی صفائی کرنے والے، چوکیدار، دکانوں کے معاون، نان بائی، گھریلو نوکر، چائے کے ہوٹلوں میں کام کرنے والے اور پھل و سبزی فروش ہوتے ہیں۔ شہر کے مختلف علاقوں میں کئی کچی آبادیاں موجود ہیں جہاں پر یہ اپنے بچوں کو ایک مہذب زندگی دینے کے خواب دیکھتے ہوئے اس نہایت سخت اور انسانی وقار سے گری ہوئی زندگی کو قبول کررہے ہیں۔[10] ان آبادیوں میں رہنے والے مزدوری تو کررہے ہیں لیکن گھریلو اخراجات کو پورا کرنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان بستیوں کی عورتیں اور بچے بھی مزدوری کے لیے باہر نکلنے پر مجبور ہیں۔ غیر رسمی شعبے کی کوئی اعداد و شمار موجود نہیں۔ کم سے کم اجرت کا کوئی اطلاق نہیں، کام کرنے کے اوقات کار بھی طے نہیں۔ ایک کام کی جگہ دس کام کروا لیے جاتے ہیں۔ ان غیر رسمی شعبوں میں ایک اہم اور یکسر نظر انداز کیا گیا شعبہ گھریلو ملازمت کا ہے۔

پاکستان میں گھریلو ملازمت ایک غیر منظّم اور بے ترتیب شکل میں موجود ہے جس میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ ان عورتوں کے فرائض میں صفائی کرنا، کھانا پکانا، بڑوں اور بچوں کا خیال رکھنا وغیرہ شامل ہے۔ پورے یا جز وقتی ملازمین کے لیے مقررہ اجرتوں کا کوئی نظام نہیں ہے۔ گھریلو ملازمین اور آجر کے

درمیان غیر رسمی معاہدہ ہوتا ہے، کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوتا۔ گھریلو ملازم صرف دوستوں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی ضمانت پر رکھے جاتے ہیں۔ اجرت علاقے، آجر کی معاشی حیثیت، کام کی نوعیت اور کارکردگی کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ کام کرنے کے اوقات کار بھی آجر اور ملازم کی مرضی اور سہولت سے طے ہوتے ہیں۔ یہ ملازم اور مالک کے مابین ایک غیر متوازی معاہدہ طاقت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جس میں ایک طبقہ دوسرے سے کئی درجہ زیادہ بااثر ہوتا ہے۔ اس رشتے میں ملازم کی حیثیت کمزور ہوتی ہے لہذا ملازم عورتیں اپنے سماجی و اقتصادی کمزوری کی وجہ سے اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتیں اور مالکان ان کا احترام نہیں کرتے۔[11] 2014 کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 74 فیصد مزدور غیر رسمی شعبوں سے وابسطہ ہیں جن میں گھریلو ملازمین کی اکثریت ہے۔ ایک مزدور کی کم سے کم اجرت 11,000 پر طے ہے جبکہ یہ اصول ان پر لاگو نہیں ہوتا حالانکہ اکثر ان کے کام کرنے کا وقت بڑھ بھی جاتا ہے۔[12] کام کرنے والی عورتوں اور مالکان میں ایک دوسرے کو پکارنے میں بھی طبقاتی فرق اور عدم برابری نظر آتی ہے۔ یہ ملازمائیں اپنے اصل نام کی جگہ ماسی، خالہ، اماں، جمادارنی وغیرہ کے نام سے پکاری جاتیں ہیں جب کہ مالکن کو صاحبہ، بیگم صاحب باجی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ ملازمین کئی گھنٹوں تک لگاتار کام کرنے، آرام اور چھٹیوں کی کمی، کم تنخواہ، چوری کے الزامات سے لے کر جسمانی و جنسی استحصال کا شکار ہیں۔

عورتوں کی ایک بڑی تعداد گھر سے باہر کام کرتی ہے اور ایک ہی وقت میں گھریلو زمہ داریاں نبھانے اور باہر کام کرنے کے اس خلاء کو کم تنخواہ پر کام کرنے والی عورتیں پورا کرتی ہیں۔ بارہ سے سولہ گھنٹے کی ان تھک محنت کے باوجود عورت کو نہ ہی صحیح اجرت مل رہی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے سماجی تحفظ کی کوئی سہولت ہے۔ گو کہ فیکٹری اور صنعت میں کام کرنے والے مزدور چاہے مرد ہوں یا عورت کے حالات بہت اچھے نہیں لیکن بحرحال فیکٹری میں کام کرنے والی عورت چار دیواری میں ہوتی ہے۔ کچھ اصول وضوابط اسے معلوم ہوتے ہیں جو وہ طہ کر کے وہاں جاتی ہے۔ اگر انہیں وہاں کوئی ہراسان کرے تو وہ شکایت کر سکتی ہے۔ یونین یا کمیٹی کے ذریعے یا قوانین کے ذریعے کوئی راستہ بن سکتا ہے جس کے وہ اپنی بات آگے پہنچا سکے لیکن گھروں میں کام کرنے والی عورت کو نہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں کام کر رہی ہے؟ اس کے کیا حقوق ہیں۔ وہاں انہیں ہراسان کیا جائے، اجرت نہ ملے یا کام کا کوئی مسئلہ ہو۔ ان کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ اپنی آواز پہنچائیں۔[13] پاکستانی عورت پدر شاہی کے تحت کم سماجی، معاشی اور سیاسی حیثیت کی وجہ سے انحصار اور ماتحتی کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ عورتوں کی اکثریت ہر قسم کی غربت میں مبتلا ہے۔[14]

پاکستان خاص کر کے کراچی میں ہزاروں ایسی کچی آبادیاں ہیں جہاں لاکھوں مزدور زندگی گزار رہے ہیں۔ اکثر محلوں میں عورت ملازماں ان ہی بستیوں سے آکر گھروں میں کام کرتی ہیں، اسی طرح کی ایک بستی کراچی مشرقی ضلعی حدود میں داخل ہونے والے پل کے نیچے بسی ہوئی ہے۔ اس بستی میں تقریبا 25 گھرانے ہیں رحیم یار خان ضلع سے تعلق رکھنے والے بے زمین کسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کے لیے اس بستی سے تقریبا20 عورت ملازمین سے ایک سوالنامہ کے زریعے ان کے حالات سمجھنے کی کوشش کی گئی جن میں سے 10 بہتر تفصیلات کی وجہ سے زیر نظر مضمون میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات نے محنت کش مزدور عورت کے بہت سے سماجی اور معاشی مسائل کا احاطہ کیا۔

سماجی مسائل

تعلیم: حاصل کردہ معلومات سے ظاہر ہوا کہ ان عورتوں کی عمر 17 سے 40 سال کے درمیان تھی۔ صرف ایک لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور وہ واحد لڑکی تھی جو مڈل تک تعلیم حاصل کر پائی تھی۔ صرف دو کے شوہر نے کچھ تعلیم حاصل کی تھی جن میں سے ایک نے پرائمری اور دوسرے نے سیکنڈری تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے بچوں کی تعداد کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ سات تھی۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات یہ عورتیں خود ہی اٹھاتی تھیں لیکن صرف چار کے ہی بچے اسکول جاتے تھے۔ جن میں سے صرف ایک عورت کے ایک بچے کے تعلیمی اخراجات اس عورت کی ایک مالکن اٹھاتی تھی۔

صحت وخوراک: ان دس عورتوں میں سے چھ عورتیں تین وقت، دو عورتیں دو وقت اور دو عورتیں ایک وقت کا کھانا کھا پاتی تھیں۔ انہیں امید ہوتی تھی کہ جس باجی کے گھر کام کر رہی ہیں وہ کھانا دے دیں اگر وہ کھانا نہ دیں تو انہیں کھانا پکانے کے لیے لکڑی تلاش کرنی پڑتی تھی اگر لکڑی نہ ملے تو یہ سبزی والے سے فی کریٹ دس روپے پر لکڑی اور پکانے کے لیے آلو، دال یا سبزی خریدتی تھیں۔ گھر پر کھانا لکڑی جلا کر پکایا جاتا تھا(جس کا دھواں مضر صحت ہے)۔ اس کے علاوہ قریبی فلیٹ اور گھروں سے استعمال کے لیے پانی بھر کر لاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ صبح سے شام تک مختلف گھروں میں کام کرنے اور صحیح خوراک نہ ملنے کی وجہ سے وہ مستقل بیماری اور کمزوری کا شکار رہتی جس کی وجہ سے انہیں کام میں مشکل ہوتی اور گھر اور باہر ان کا کام متاثر ہوتا تھا۔

بے اعتباری اور غربت: یہ عورتیں اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر آئیں تھیں۔ ان میں زیادہ تر عورتوں کو شہر کے لوگوں کا رویہ اچھا لگتا تھا لیکن گاؤں کی بہ نسبت یہاں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لہذا انہیں شہریوں سے معاملات میں واسطہ نہ رکھنے کا شکوہ بھی تھا۔ ان عورتوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کام کے دوران باجیاں وقت پر نہ آنے،

کام میں کوتاہی اور اپنے مزاج کی خرابی کی وجہ سے ڈانٹتی تھیں اور غصہ بھی کرتی تھیں۔ کام کے دوران انہیں ملے جلے رویے کا سامنا رہتا تھا۔ کچھ باجیاں اچھے سے پیش آتی تھیں اور کچھ سختی سے۔

گھر میں موجود مرد نہ ہی گھر پر خرچہ دیتے تھے اور نہ ہی اپنے بچوں کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ دو عورتوں کے علاوہ ان تمام کے مرد گھر پر خرچہ نہیں دیتے اور اگر دیتے بھی تھے تو اپنی مرضی اور سہولت سے دیتے تھے۔ سوال نامے بھرنے اور بات چیت کے دوران مسلسل دو سے تین مرد آس پاس چکر لگاتے رہے جس سے یوں لگتا تھا کہ یہ اپنی بیویوں پر شک بھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عورتوں نے ان کی موجودگی کی وجہ سے چند سوالات جیسے کام کے دوران کوئی سانحہ یا واقعہ جو کبھی نہ بھولی ہوں؟ میں بہت محتاط انداز میں جواب دیے۔

پل کے نیچے رہنے میں مسائل: گھریلو مزدور عورتوں کو بے شمار الگ الگ مسائل کا سامنا تھا۔ پل کے نیچے ایک گندے نالے کا بہاو تھا جس کی وجہ سے اس بستی میں بہت گندگی تھی۔ کچرا، گند، چوہے، کیڑے مکوڑوں اور لوگوں کے پیشاب کر جانے کی وجہ سے علاقے میں شدید بدبو تھی یہ ہی وجہ تھی کہ یہاں بیماریاں پھیلتی تھیں اور جن سے زیادہ تر اثر انداز بچے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ رات کو چور اچکوں اور کیڑے مکوڑوں کا بھی ڈر رہتا تھا۔

یہ بات واضع تھی کہ گھروں میں کام کرنے والی عورت غربت کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی اور ان حالات میں دوہری ذمہ داری نبھا رہی تھی اور کمانے کی بھی اور کھلانے کی بھی۔ شوہر اور بچوں کی مکمل ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہے۔ یہ عورتیں صبح شوہر اور بچوں کو ناشتہ دے کر، اپنے بچوں کو اسکول چھوڑ کر کام پر جاتی ہیں۔ ان کا ناشتہ روٹی اور چائے ہوتا ہے جس میں اکثر دودھ شامل نہیں ہوتا۔ ان کے شوہر بچوں کو اسکول چھوڑنے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی واپس لاتے۔ یہ ذمہ داری عورت ہی نبھاتی ہے۔ جو بچے اسکول نہیں جاتے وہ صبح سے شام تک اس بستی میں جھگی میں وقت گزارتے تھے۔ اگر کوئی رشتہ دار ان کا خیال رکھ لے تو ٹھیک ورنہ گھر پر رہ جانے والے بچے انتہائی حد تک عدم تحفظ کا شکار تھے کیونکہ یہ جھگیاں بوسیدہ کپڑے کی چادروں سے بنی ہوئی تھیں۔ تمام جھگیاں آپس میں ملی ہوتی تھیں اور کوئی بھی خاموشی سے باآسانی ان جھگیوں میں داخل ہوسکتا تھا۔

عورتوں کا کہنا تھا کہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر جن گھروں میں جاتی تھیں وہاں مختلف مزاج کی باجیوں سے واسطہ پڑتا جو باجیاں سختی سے بات کرتیں اور زیادہ غصہ ہوتیں ان کے کام جلدی جبکہ اچھی باجیوں (وہ جو عزت سے بات کریں) کے کام کا وقت اپنی سہولت سے رکھتی تھیں۔ عورتوں کو کپڑے دھونا مشکل لگتا تھا کیونکہ یہ محنت طلب کام ہے، غیر متوازی خوراک کی وجہ سے ان کے اندر طاقت کی کمی تھی اور وہ جلد تھکن کا شکار ہوجاتی تھیں۔ باجیاں انہیں جو بچا کچا کھانا اور باسی روٹیاں دیتیں، وہ بھی یہ اپنے بچوں کے لیے رکھ لیتی اور گھر آکر بچوں کے ساتھ مل کر کھاتی تھیں۔

معاشی مسائل: ان گھریلو مزدور عورتوں کے شوہر مختلف قسم کے روزگار جیسے دکان، شراب خانے، دہاڑی پر مزدوری کرتے تھے، دو کے شوہر چوکیدار اور ایک کا رکشہ چلاتا تھا۔ جبکہ دو کے شوہر بیکار تھے، جیسا کہ پہلے لکھا گیا ان میں سے صرف دو گھر پر خرچہ دیتے تھے۔ یہ عورتیں روزانہ 5.5 سے لے کر 7.5 گھنٹے، دو سے چھ گھروں میں کام کرتی تھیں۔ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی لیکن اگر کوئی باجی بلائے تو اس کے الگ سے پیسے دیتی تھی اور یہ اکثر چلی جاتی تھیں۔ ان میں سے پانچ بچپن سے گھروں میں کام کررہی تھیں جبکہ پانچ نے شادی کے بعد کام شروع کیا تھا۔ یہ لوگوں پر بھروسا اور اپنی سمجھ کی بنیاد پر کسی بھی گھر میں کام پر لگ جاتی تھیں۔ صرف ایک عورت آس پاس سے معلومات کرکے کام اٹھاتی تھی۔ انہیں وقت پر آنے، چھٹی نہ کرنے، صفائی کا خیال رکھنے، دوسری باجیوں کو ان کے گھر کی بات نہ بتانے اور اچھے کام جیسی شرائط پر کام دیا جاتا تھا۔ ان میں سے دو عورتیں دفتر میں کام کرتی تھیں جن کی ماہانہ کمائی باقی عورتوں کے مقابلے زیادہ تھی۔ ان تمام کی ماہانہ آمدنی 4,200 سے لے کر 19,300 تک کی حدود میں پائی گئی۔ ان کے لیے اجرت پر کام کرنا فائدہ مند نہیں تھا۔ باجیاں 20 روپے سے لے کر 100 روپے تک دیتی تھیں اور بہت کام لے لیتیں۔ اگر اتوار کو یا اجرت پر کام کریں تو ماہانہ 200 سے 2,600 تک کمائی ہو جاتی تھی۔ لیکن اگر یہ کسی اتوار کام نہ کرسکیں تو یہ اضافی اجرت ظاہر ہے کہ کم ہوجاتی تھی۔

ان کی بستی سے پہلے گھر کا فاصلہ 5 منٹ سے لے کر آدھا گھنٹہ تھا۔ یہ ایک ہی گھر میں مختلف کام بھی کرتی اور کسی کسی گھر میں صرف ایک کام بھی کرتی تھیں۔ یہ سب ہی ایک سے چار گھروں میں کپڑے دھوتی ہیں اور ایک سے چھ گھروں میں جھاڑو لگاتی تھیں۔ نو عورتیں گھروں میں برتن دھوتی تھیں۔ پانچ عورتیں ایک سے دو گھروں میں پوچا اور پانچ عورتیں ایک سے دو گھروں میں جھاڑ پوچھ (dusting) کرتی تھیں، تین عورتیں ایک سے تین گھروں میں استری کرتی تھیں جبکہ چار عورتیں ایک سے تین گھروں میں روٹی اور کھانا پکاتی تھیں۔ ان میں سے چار کو جھاڑو دینا جبکہ باقی کو مختلف کام آسان لگتے ہیں۔ پانچ عورتوں کو کپڑے دھونا، دو کو استری کرنا، دو کو جھاڑو پوچا جبکہ ایک کو ڈسٹنگ کرنا مشکل لگتا ہے۔

ان تمام عورتوں کے مطابق تمام جھگیوں سے مقامی بدمعاش گروہ رہائش کے لیے 500 روپے فی جھگی بھتہ لیتا تھا لیکن چند ماہ سے وہ ان سے بھتہ لینے نہیں آرہا جس کی وجہ سے انہیں کرایہ نہیں دینا پڑ رہا۔ اس کے علاوہ جن جھگیوں میں بجلی لگی تھی وہ فی ماہ 500 روپے کرایہ اور 300 روپے ٹی وی کیبل کے دے رہے

تھے۔ سات عورتوں نے بجلی کی سہولت لے رکھی تھی جبکہ تین عورتوں نے یہ سہولت حاصل نہیں کی۔ صرف دو گھروں میں کیبل کی سہولت موجود تھی۔ اس کے علاوہ اضافی اخراجات میں گھر کا راشن، سبزی اور لکڑی شامل تھے۔ جس میں زیادہ خرچہ لکڑی کا ہوتا تھا۔ اگر کھانا پکے تو لکڑی اور سبزی کا کل ملا کر 50 سے 100 روپے روزانہ تک کا خرچہ ہوتا تھا۔ راشن کی چیزیں جیسے آٹا، تیل، گھی، صابن وغیرہ زیادہ تر حسب ضرورت لے لیا جاتا تھا صرف ایک عورت گھر میں ماہانہ راشن ڈلواتی تھی۔ ان عورتوں کا کہنا تھا کہ شہر میں ایک کمرے کا کرایہ 5,000 سے 6,000 روپے تھا اور ان عورتوں کے دوسرے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ ان کے لیے ایک کمرہ لینا مشکل تھا۔ پورے مہینے کی ان تھک محنت سے وہ جو کچھ کماتی تھیں، اس رقم میں وہ بہت مشکل سے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے روٹی اور کپڑے کا انتظام تو کر لیتی تھیں لیکن کسی بہتر رہائش کی طرف رخ نہیں کرسکتیں کیونکہ ان کے بچوں کی تعداد زیادہ اور شوہر گھر کے خرچ میں کسی بھی قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پوچھ گچھ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ اگر انہیں کولڈ ڈرنک کی خالی بوتلیں، سوکھی روٹی یا ردی ملتی تھی تو وہ اسے کباڑی والے کو بیچتی تھیں اور جو پیسے ملتے ان سے بچوں کے لیے کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید لیتی تھیں۔

سیاسی مسائل: اپنے کام سے مطمئن ہیں یا نہیں اور کیوں؟ اس سوال کے جواب میں دو طرح کی بات سامنے آئی۔ ایک طرف آٹھ عورتوں کا کہنا تھا کہ وہ مطمئن ہیں کیونکہ یہ ان کا روزگار ہے لیکن دوسری طرف ان ہی عورتوں کا کہنا تھا گھروں میں کام کرنا پسند نہیں کیونکہ اس سے ہر دن ڈانٹ پڑتی ہے اور تھکن ہو جاتی ہے لیکن بچوں کی خوراک، تعلیم اور گھر کا خرچہ چلانے کے لیے کام کرتی ہیں۔ صرف دو کا خیال تھا کہ وہ مشکل میں زندگی گزار رہی ہیں۔

یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ اس محنت کش عورت کو گھر کی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے معاش کی تلاش کے لئے تو آزادی دے دی گئی ہے لیکن یہ نہ ہی اپنی اولاد کے لیے فیصلے لے سکتی اور نہ ہی کسی معاملے میں اس سے رائے لی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر مرد کا حکم ہی چلتا ہے۔ پھر چاہے مرد وراثت میں لینے والی زمین پر قبضہ کریں، ان کی بیٹیوں کو کسی سے پیسے لے کر بیاہ دیں یا کسی کے بھائی یا چچا کے جرم پر ان کی شادی دشمن خاندان میں کردیں یا انہیں اور ان کے بچوں کو کہیں مزدوری پر لگا دیں۔ ان کو کسی بھی پل کے نیچے، کسی کچی آبادی میں رکھیں یا واپس گاوں لے جائیں یہ تمام فیصلے کا اختیار صرف مرد کے پاس ہی ہوتا ہے۔ یہ چپ چاپ اسے حاکم اور خود کو محکوم سمجھ کر اپنی زندگی گزار دیتی ہیں۔ یہ عورتیں اپنے کام کے دوران ہونے والی زیادتی اور ظلم کو مصلحت کی چادر میں چھپا کر اپنے کام جاری رکھتی ہے۔ پدرشاہی نظام کے بنائے گئے ریت رواج ایسے مردوں کو شیر کردیتے ہیں جو ظلم کر رہے ہوں یا کسی قسم کا بھی ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہوں۔

پدرشاہی اور عورت: ان مسائل کی روشنی میں اخز ہونے والا نتیجہ ثابت کرتا ہے کہ یہ عورت پیدا ہونے کے ساتھ ہی اضافی بوجھ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ غریب گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی غذائی کمی کا شکار ہوتی ہے۔ اسے تعلیم کا بنیادی حق نہیں دیا جاتا بلکہ گاوں میں زمینوں پر ماں کے ساتھ کام کرنے بھیج دیا جاتا ہے اور شہر میں کسی باجی کے گھر بچے سنبھالنے اور چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے رکھوا دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ کام کرتی ہے وہاں اسے کمتر سمجھا جاتا ہے اور اپنے ساتھ نہ ہی بٹھایا جاتا ہے اور نہ ہی کھلایا پلایا جاتا ہے۔ اس کی محنت کے عوض اس کے ماں باپ کو رقم دی جاتی ہے۔ لوگوں کا بچا کچا کھانے والی اور اترن پہننے والی اس لڑکی کی شادی بچپن میں ہی کسی رشتہ دار کے بیٹے سے طہ کردی جاتی ہے۔ پھر چاہے وہ اس سے عمر میں دگنا ہو یا چھوٹا۔ بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھتے ساتھ ہی دوسری ماہواری کے بعد اس کی شادی کردی جاتی ہے۔ شادی ہوجانے کے ساتھ ہی اس کی دوہری زمہ داری کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایک طرف شوہر اور اس کے خاندان اور بچوں کے کام اور ایک طرف باہر سے کما کر لانے کی زمہ داری۔

اس کے مقابلے میں مرد جو شروع سے اپنے گھروں میں ماں کی درگت بنتے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور شروع سے بہنوں کے مقابلے اچھے کھانے، اچھا پہننے اور ان کی حق تلفی کرتے آرہے ہوتے ہیں، جو کچھ کماتے ہیں، اپنی آرائش و آرام پر خرچ کردیتے ہیں۔ عورت کو ایک حصار میں قید کردیتے ہیں جس میں مسلسل اسے کمتر ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے، کڑی نگرانی میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اپنا نام جوڑ کر کیے گئے احسان کے بوجھ کو اس پر لاد دیا جاتا ہے۔ حفاظت کے ضامن یہ مرد ان کو صبح سے شام تک مختلف گھروں میں کام کی اجازت دے دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال سے گھروں میں عورتیں یا بوڑھے ہی ہوتے ہیں جن سے ان کی عورتوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے اونچی آواز میں بات کرنا، چلنا، بیٹھنا۔ اس کے آنے جانے کے اوقات کار ان سب پر مرد ایک گہری نظر رکھتا ہے کیونکہ وہ خود کو حاکم اور اسے محکوم سمجھتا ہے۔ اپنی صحت کے حوالے سے آگہی نہ ہونے کی وجہ سے عورت ہر سال دو سال بعد بچے پیدا کرتی ہے۔ اس کی بھی چند اہم وجوہات ہیں۔ عورت کا ان پڑھ ہونا، مذہبی طور پر بچوں کی پیدائش میں وقفے کو برا سمجھنا اور بیٹے کی خواہش۔ ایک بیٹا پیدا ہونے کے بعد اگر دوسرا بیٹا ہو تو شوہر اور سسرال دوہری خوشی مناتے ہیں اور ایک بیٹی کے بعد دوسری بیٹی کی پیدائش سے نوبت طلاق اور دوسری شادی تک آجاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ان کی صحت دن بدن گرنے لگتی ہے اور ان میں سے اکثر ہی خون کی کمی کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کے جوڑوں اور ہڈیوں میں تکلیف ہوتی ہے اور یہ زچگی میں اور اس کے بعد مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اکثر بیمار رہتی ہیں اور جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

اگر معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ہر طرف سے جکڑی ہوئی نظر آتی ہیں، جن گھروں میں یہ کام کرتی ہیں وہاں موجود باجیاں یا بیگمات گھریلو ملازمین کو تنخواہ بہت ناپ تول کر اور اپنا ہاتھ کھینچ کر دیتی ہیں کیونکہ وہ بھی گھر چلانے کے لیے کیے گئے خرچ سے رقم صرف کررہی ہوتی ہیں جو انہیں ان کے شوہر یا بیٹے دیتے ہیں اور ان کے متعلق ان سے باز پرس بھی ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک محنت کرکے کمائی گئی رقم ناکافی ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے گھر کے مرد یا اس کے بچے بھی اس کے ساتھ اپنی کمائی کا حصہ ڈالیں تاکہ وہ بہتر زندگی گزار سکے۔ لیکن اگر وہ بچوں کو پڑھانا چاہتی ہے تو اسکے لیے زندگی مزید مشکل ہے۔ معاشی طور پر غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے یہ خودترسی کا شکار بھی ہوتی ہے اور ہر ایک سے امداد کی طلبگار رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں اتنی محنت کرنے کے باوجود اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔ اکثر لوگ یہ ہی کہتے نظر آتے ہیں کہ انہیں تو عادت ہے مانگنے کی، یہ چوریاں کر لیتی ہیں، انکو کمرے میں اکیلا نہ چھوڑا کریں چیزیں غائب کر لیتی ہیں، انہیں اپنے بچوں کے ساتھ کھانا نہ دیں بیمار ہوجائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے جملے ہیں جو ہم اکثر ہی سنتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال ستمبر میں سوشل میڈیا پر ایک تصویر بہت عام ہوئی جس میں مالکان ریسٹورنٹ میں کھانا کھارہے ہیں اور کام کرنے والی دو لڑکیاں ان کے بچے کو سنبھال رہی ہیں۔ جس پر ڈان اخبار نے ایک مضمون شائع کیا۔ تصویر میں نظر آنے والی ناانصافی اور خبر کے مواد سے زیادہ خبر کے آخر میں اخبار کی طرف سے دی گئی رائے شماری کے نتائج پر افسوس ہوا جس میں پوچھا گیا تھا کہ کیا گھریلو ملازمین کو باہر لے کر جانا چاہیے؟ اس کے جواب میں 70.54 فیصد افراد کا جواب تھا نہیں جبکہ 29.5 فیصد لوگ نوکروں کو اپنے ساتھ باہر لے جانے پر متفق تھے۔[15] یہ مضمون بہت سے سوالات کی طرف متوجہ کررہا تھا کہ آخر یہ کون سی وجہ ہے جو لوگوں کو گھریلو ملازمین کو اپنے جیسا انسان سمجھنے سے روکتی ہے؟ انہیں ایسی مخلوق کیوں سمجھا جاتا ہے جسے آسانی سے نظر انداز کردیا جاتا ہے یا لوگ انہیں ساتھ بٹھانے سے کیوں کتراتے ہیں؟ کام کے دوران جنسی طور پر ہراسانی بھی ان عورتوں کے لیے ایک اہم مسئلہ جس کا سامنا گھریلو کام کاج کرنے والی عورتوں کو اکثر ہی رہتا ہے لیکن وہ شرم، بدنامی کے خوف اور سماجی دباو کی وجہ سے اس کی شکایت نہیں کرتیں۔ شکایت نہ کرنے کی ایک وجہ نوکری سے ہاتھ دھونے کا خطرہ اور گھر بیٹھ جانا بھی ہے جس کے بعد نوبت فاقوں تک آسکتی ہے۔ اس لیے یہ اپنی زبان بند رکھتی ہیں۔

ریاست کا کردار

ریاست کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں، چاہے وہ کسی بھی طبقے یا پیشے سے منسلک ہوں انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرے۔ بہ حیثیت پاکستانی، بہ حیثیت مزدور ان کے لیے آمدنی کے حصول میں مددگار بنے۔ جب انکا ذریعہ معاش مناسب زندگی گزارنے کے قابل ہوگی تب ہی وہ غربت کی سطح سے اوپر آئے گا۔[16] گھریلو کام کرنے والوں کو بھلی روزی (decent livelihood) کے تحت بنیادی حقوق ملنے چاہیے۔ انہیں ایک مزدور سمجھنا ان مزدوروں کا بنیادی حق ہے۔ انہیں اور ان کے کام کو عزت ملے ان کو شعور اور آگاہی، تنظیم سازی کا حق، یہ وہ سارے حقوق ہیں جن کے لیے اس مزدور طبقے کو جدوجہد کی راہوں پر چل کر ہی حاصل ہوسکیں گے۔ مزدوروں کے بین ال اقوامی ادارے (International Labour Organization/ ILO) نے گھریلو ملازمین کے تحفظ، بنیادی حقوق اور کام کرنے کے اصول وضوابط اور بھلی روزی کی فراہمی کے لیے مسودہ 189 ترتیب دیا ہے جسے 2011 میں عالمی طور پر منظوری ملی۔ جو ملک اس قانون سازی کو منظور کرتا ہے اس کی حکومت باضابطہ طور پر اس پر عمل کرتی ہے اور ILO (آئی ایل او) کو وقتاً فوقتاً رپورٹ دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے اب تک پاکستان میں اسے منظوری نہیں ملی ہے۔ سفارشات 201 بھی بین الاقوامی مزدور کانفرنس 2011 میں مسودہ 189 کے ساتھ ہی منظور ہوئیں۔ یہ مسودہ 189 کو مکمل کرتی ہیں۔ یہ حقوق کے نفاذ میں عملی رہنمائی اور قانونی اصول وضوابط بیان کرتی ہیں۔ اس مسودے کے مطابق، گھر کی صفائی، کھانا پکانے، کپڑے دھونے، بچوں اور بزرگوں کا خیال رکھنے، بیماروں کی دیکھ بال کرنے، باغبانی، چوکیداری، خاندان کے لیے ڈرائیور، پالتو جانوروں کا خیال رکھنے والے سب ہی گھریلو ملازمین کی فہرست میں آتے ہیں۔ مسودہ 189 میں کم سے کم اجرت کا تعین، تمام گھریلو ملازمین کے انسانی حقوق کا فروغ اور تحفظ، کام کرنے کی جگہ پر آزادی اور انفرادی یا مشترکہ حقوق مانگنے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بچوں سے محنت مشقت کرانے کا خاتمہ، ملازمت کے دوران امتیازی سلوک، تمام اقسام کے تشدد، ہراساں کرنے اور غلط رویے کے خلاف تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔[17]

جدوجہد کا راستہ: یہ عورت جو پدرشاہی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں کا سامنا کررہی ہے اس کے لیے اقوام متحدہ کے بنائے گئے اصول زندگی میں کچھ نرمی اور سہولیات تو فراہم کریں گے لیکن حقیقی مزدور کو اپنی اجرت حاصل کرنے میں قطعا مددگار ثابت نہیں ہونگے۔ اگر مزدور، چاہے وہ گھریلو ملازم ہو زرعی مزدور ہو یا صنعت کا حصہ ہو اس کے لیے منظّم ہونا بنیادی عمل ہے۔ یقیناً عورت ملازم ایک نا ختم ہونے والی مسلسل محنت کررہی ہے۔ اسے اپنے مسائل کے حل کے لیے منظّم ہونے کی شدت سے ضرورت ہے۔ اگر یہ اپنے حقوق کی آگہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ لیکن اس کے لیے متحد ہونے اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ پدرشاہی سے بھی مقابلہ کرنا بہت ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ عورت خود پدرشاہی کا شکار ہوتی ہے اور اس نظام

کے ہتھکنڈوں کو دوسری عورتوں پر لاعلمی میں استعمال کرتی ہے۔ اسی لیے ہر عورت جو اپنے حق کے لیے کھڑی ہوتی ہے وہ نہ صرف سرمایہ داری، جاگیرداری کے خلاف جنگ کرے گی بلکہ پدرشاہی کو بھی سوچتے سمجھتے ہوئے اپنی بہنوں اور ساتھیوں میں پدرشاہی کے خلاف آواز اٹھائے گی۔

حوالہ جات

1. Raza, Mansoor. "On death's door: trade unions in Pakistan." Dawn, 1st May 2016. Accessed from http://www.dawn.com/news/1255333
2. "Labour welfare vital for growth: Shahbaz." The Express Tribune, 1st May 2016, p. 4. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1094822/labour-day-labour-welfare-vital-for-growth-says-shahbaz/
3. Mustafa, Waqar. "State of Human Rights 2015, Labour, Rights of the Disadvantaged." p. 3. Human Rights Comission of Pakistan, March 2016. Accessed from http://hrcp-web.org/hrcpweb/wp-content/uploads/2016/04/Labour-2016.pdf
4۔ خان، آصف۔ ''پاکستان میں نجکاری اور آزاد تجارت کے عام زندگی پر اثرات''۔ چیلنج مئی تا دسمبر 2013، صفحہ 9۔
5. "Tackling Poverty." The Express Tribune, 10th April 2016, p. 6. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1081786/tackling-poverty/
6. Mazhar, Nargis. "Pakistan Economic Survey 2013-14, Population, labour Force and Employment." Ministry of Finance, Government of Pakistan, p. 184. Accessed from http://finance.gov.pk/survey/chapters_14/12_Population.pdf
7. Bonner, Christine. "Women in informal employment: Globalizing and Organizing (WIEGO), "Domestic Workers Around the World: Organising for Empowerment." 30 April 2010. Accessed from http://wiego.org/sites/wiego.org/files/ publications/files/Bonner-Organising-for-empowerment-2010.pdf
8. Mazhar, Nargis. "Pakistan Economic Survey 2013-14, Population, labour Force and Employment." Ministry of Finance, Government of Pakistan, p. 186. Accessed from http://finance.gov.pk/survey/chapters_14/12_Population.pdf
9. Mazhar, Nargis. Pakistan Economic Survey 2013-14.
10. Hisam, Zeenat. "City and the migrant labourer." Dawn, 30 June 2014. Accessed from http://www.dawn.com/news/1115923
11. Shahid, Ayesha. "A Maid Work." Tanqeed, A magazine of politics and culture, January 2014. Accessed from http://www.tanqeed.org/2014/01/a-maids-work/
12. Usman. Ali, "Know your rights: Domestic servents." Express Tribune, 28 October 2014. Accessed from http://tribune.com.pk/story/782565/know-your-rights-domestic-servants/
13. Mehmood, Aeema and Kousar, Shabana. "The state of women workers in Pakistan." Laborwatch. tv. Accessed from http://videos.labourwatchpakistan.com/?video=the-state-of-women-workers-in-pakistan
14. Bari. Farzana, Marium, S. Pal. "Country briefing paper on Women in Pakistan." Asian Development Bank. July 2000, p 15. Accessed from www.adb.org/sites/default/files/institutional-document/32562/women-pakistan.pdf
15. Rehman, Anum. "Domestic staff at dinner restaurant owners." 11 september 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1167534
16. Ume laila. "The state of women workers in Pakistan." Accessed from http://videos.labourwatchpakistan.com/?video=the-state-of-women-workers-in-pakistan
17. International Labour Organization. "Convention No 189, Decent work for domestic workers." ILO International Labour Office, Geneva. Accessed from http://www.ilo.org/wcmsp5/groups/public/@ed_protect/@protrav/@travail/documents/publication/wcms_161104.pdf

بقیہ حوالہ جات: زمیندار خدا!

11. Memon, Sarfaraz. "11 killed as PPP, PML-F workers clash during local bodies election in Khairpur." Express Tribune, October 31, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/982713/11-killed-eight-injured-in-clash-during-local-bodies-election-in-khairpur/
12. "Three killed in Khairpur during Sindh-wide protest over 'vote rigging'." Dawn, May. 17, 2013.Accessed from https://www.dawn.com/news/1011766
13۔ پیر جو گوٹھ ''خیر پور'' کے مقامی لوگوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق۔
14۔ جعفری، عقیل عباس۔ صفحہ 341۔
15. Tunio, Hafeez. "Qureshi religious awakening: SajjadaNashin orders his followers to reorganize themselves." Express Tribune, November 28, 2011. Accessed from https://tribune.com.pk/story/298711/qureshis-religious-awakening-sajjada-nashin-orders-his-followers-to-reorganise-themselves/
16۔ جعفری، عقیل عباس۔ صفحہ 344 سے 345۔
17. Dawn. "Shah MehmoodQureshi." Dawn, April 29, 2013. Accessed from http://www.dawn.com/news/1024485/shah-mehmood-qureshi-2.
18. Express Tribune. "Profile: Shah MehmoodQureshi, from PML, to PPP to PTI." Express Tribune, November 27, 2011.Accessed from http://tribune.com.pk/story/298471/profile-shah-mehmood-qureshi-from-pml-to-ppp-to-pti/
19. Tunio, Hafeez. "Qureshi religious awakening: SajjadaNashin orders his followers to reorganize themselves."
20. Express Tribune. "PTI leaders declare assets." Express Tribune, August 24, 2012. Acccessed from http://tribune.com.pk/story/425741/pti-leaders-declare-assets/
21۔ جعفری، عقیل عباس۔ صفحہ 429 سے 430۔
22۔ جعفری، عقیل عباس۔ صفحہ 430 سے 434۔
23. Express Tribune. "Profile: YousafRazaGilani's political career." Express Tribune, April 27, 2012. Accessed From http://tribune.com.pk/story/370698/profile-yousaf-raza-gilanis-political-career/
24. Story of Pakistan. "Syed YousafRazaGillani." Story Of Pakistan. August 2013. Accessed from http://storyofpakistan.com/syed-yousaf-raza-gillani
25. The News. "PM attends son's wedding in Karachi." The News, March 28, 2008. Accessed from https://www.thenews.com.pk/archive/print/656116-pm-attends-sons-wedding-in-karachi

زمیندار خدا!

تحریر: لال سائل

جنوبی ایشیا کے زیادہ تر ممالک میں خصوصاً پاکستان میں بھوک اور بے روزگاری کی اہم وجہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس کے علاوہ عوام مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ آپس میں لڑ جھگڑ کر تباہی کی طرف گامزن ہیں۔

انسانی تاریخ میں حکمران طبقہ ہمیشہ وہی رہا ہے جس نے پیداواری وسائل پر قبضہ جمایا ہو۔ برطانوی دور حکومت میں ہم ایک ہی نظام کے غلام تھے، مگر آج ہم جاگیردارنہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے غلام ہیں۔ ان دونوں طبقات کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی ہیں جن کے زیر اثر عام آدمی اپنے زندگی کے ذاتی فیصلے بھی خود نہیں کرسکتا۔ اس طبقے کو عام لوگوں کی طاقت بھی حاصل ہوتی ہے جسے مذہبی پیشوا و رہنما یا سادے لفظوں میں پیر و مرشد بھی کہا جاتا ہے۔

مذہبی رہنماؤں کو بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے لیے عقیدت مند مرید اپنی جان و مال کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پاکستان میں پیری اور مریدی کئی عشروں سے چلی آرہی ہے۔ لفظ مرشد سے مراد ہے رہبری کرنے والا اور مرید سے مراد ہے پیروی کرنے والا۔ مرید اپنے مرشد کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں اور اس کے ہر حکم کے تابعدار رہتے ہیں۔ مرشد کے لیے اپنا مال خرچ کرنے کو ثواب سمجھتے ہیں۔1 یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پیروں کو مضبوط کرنے اور انہیں طاقتور بنانے میں مریدوں کا ہاتھ شامل ہوتا ہے۔ پاکستان سمیت بھارت اور بنگلادیش میں بھی ایسے کئی پیر ہیں جن کا سلسلہ کئی صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ پیر کی وفات کے بعد اس کے خاندان کے ہی کسی ایک فرد کو خاندان کا سربراہ اور پیر مقرر کردیا جاتا ہے جسے تمام مریدین بھی اپنا نیا روحانی و مذہبی پیشوا تسلیم کرلیتے ہیں۔ گزرے ہوئے پیروں کے مزاروں پر ان کے عرس اور دیگر تقریبات پر لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ مرید اپنے مرشد کی درگاہ پر حاضری دینے کے علاوہ نقد رقم، گندم، چاول یا کوئی جانور بھی نذرانے کے طور پر دیتے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کی اکثر معروف درگاہوں پر مریدین ہرسال ایک مقررہ رقم بطور نذرانہ بھی دیتے ہیں۔ ملک میں ایسے بھی پیر ہیں جن کے لاکھوں کی تعداد میں مرید موجود ہیں۔

سندھ اور پنجاب میں گیلانی، جیلانی، قریشی، مخدوم اور سید خاندان یہاں قابل زکر ہیں۔ ان سب خاندانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کے ان کا سلسلہ نسب نبی کریمؐ کے خاندان سے ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان خاندانوں اور پیروں کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آتے ہیں۔ ماضی میں یہ نسل درنسل چلنے والا پیروں کا یہ طبقہ دین کی تبلیغ کے لیے خدمات سرانجام دیتا تھا لیکن آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ پیر نہ صرف دین بلکہ سیاست میں بھی توجہ دے رہے ہیں۔ پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں کئی مذہبی، سیاسی خاندان قیام پاکستان کے بعد سے مستقل نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بااثر پیر خاندان بھی شامل ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں لوگ زیادہ تر ووٹ اپنے مرشد یا سید کو دیتے ہیں اور یوں یہ خاندان اپنی مذہبی طاقت کے بلبوتے انتخابات جیت جاتے ہیں۔ مرید مرشد کو ووٹ دینا بھی باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے کچھ ایسے پیر اور ان کے خاندان کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات حاصل کی گئی ہیں جیسے کہ ان کا سلسلہ نسب کیا ہے، ان کا پاکستانی سیاست میں کیا کردار رہا ہے اور ان کے خاندان کے باقی افراد کن حکومتی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔

پیر پگارا خاندان اور حرتحریک

حرتحریک کا پہلا مرحلہ

پیر صبغت اللہ شاہ اول پہلے پیر پگارا تھے۔ پگارو کے لفظی معنی ہیں پگڑی والا۔ پیر صبغت اللہ شاہ اول کے والد کا نام پیر محمد راشد شاہ اور دادا کا نام پیر محمد بقا شاہ تھا۔ پیر محمد بقا شاہ کا سلسلہ نسب اٹھارویں پشت میں شاہ علی مکی لکیاری سے ملتا ہے جو عرب سے سندھ تشریف لائے تھے۔ شاہ علی مکی لکیاری کا سلسلہ نسب تیرویں پشت میں حضرت امام حسین رضہ اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔ پیر پگارا کے سندھ اور بلوچستان میں نسل درنسل لاتعداد مرید ہیں۔ پیر پگارا کے مرید نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت میں بھی موجود ہیں۔ پیر صبغت اللہ شاہ اول نے 1824 میں سب پہلے سکھوں کے خلاف تحریک چلائی۔ اس وقت پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی جو آہستہ آہستہ سندھ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب سکھ سندھ کی طرف بڑھنے لگے تو پیر پگارا نے جہاد کا عزم مصمم کرلیا اور اپنے مریدوں کو اس جہاد میں شامل ہونے کے لیے خطوط لکھے اور ایک تحریک بنائی جسے ''حر'' تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک میں سندھ سے بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوئے جو پیر صاحب صبغت اللہ شاہ اول کے مرید بھی تھے۔ اس کے بعد میں پیر پگارا سکھوں کے خلاف شاہ عبدالعزیز (شمس الہند) کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ اس تحریک کا مرکز دلی میں تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے پیر پگارا سے بالاکوٹ میں سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کی درخواست کی اور اپنے شاگرد سید احمد شہید کو نمائندے کے طور پر پیر جو گوٹھ، خیر پور

بھیجا۔ پیر پگارا نے فوری طور پر پیشکش قبول کی اور اپنی جماعت کو سکھوں کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے کی ہدایت جاری کردیں۔ پیر صبغت اللہ شاہ اول نے فوجی تربیت دینے کے لیے جماعت کو 12 حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصے میں تقریباً 300 حر اور ایک خلیفہ کمانڈر کے طور پے مقرر کیا گیا تھا۔ بالا کوٹ میں حروں کے ساتھ لڑائی میں سکھوں کا بھاری نقصان ہوا، ہزاروں کی تعداد میں سکھ مارے گئے۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور پشاور پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ پیر پگارا صبغت اللہ شاہ یکم رمضان 1246 ھجری بمطابق 8 فروری، 1831 کو پیر جو گوٹھ میں انتقال کرگئے اور یوں پیر پگارا کی جانب سے سید احمد شہید کو ملنے والی افرادی قوت اور فوجی امداد کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ 6 مئی، 1831 کو سید احمد کو بالاکوٹ میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید کردیا گیا۔ پیر صبغت اللہ شاہ اول کے انتقال کے بعد دوسرے پیر پگارا پیر علی گوہر شاہ نامزد ہوئے۔ علی گوہر شاہ 1826 میں پیدا ہوئے اور 28 اپریل، 1847 میں وفات پائی۔[2]

حر تحریک کا دوسرا مرحلہ

پیر سید علی گوہر شاہ اول کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اور تیسرے پیر پگارا سید حزب اللہ شاہ نے برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ اس طرح 1880 میں حر تحریک کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ پیر حزب اللہ شاہ نے برطانوی حکومت کے خلاف حر جماعت کو منظّم کیا جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے ان پر جھوٹے مقدمات قائم کرکے گرفتار کرلیا۔ پیر پگارا کی وکالت ایک ہندو وکیل نے کی اور انہیں رہا کروالیا۔ حر تحریک کے خلاف انگریز حکومت نے کئی حراستی کیمپ قائم کیے اور کئی حروں کو گرفتار اور شہید کیا۔ 21 اگست، 1890 میں پیر حزب اللہ شاہ کے انتقال کے بعد حر تحریک کا دوسرا مرحلہ ختم ہوگیا۔

حر تحریک کا تیسرا مرحلہ

پیر حزب اللہ شاہ کے بیٹے اور چوتھے پیر پگارا پیر علی گوہر شاہ ثانی تھے جن کی جلد وفات ہوگئی۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ مردان شاہ اول کو پانچواں پیر پگارا قرار دیا گیا انہوں نے ہی حر تحریک کا تیسرا مرحلہ چلایا۔ شاہ مردان نے اپنے بڑے بھائی علی گوہر شاہ کی وفات کے بعد پھر سے برطانوی نوآبادیاتی نظام کے خلاف حر تحریک کو منظّم کیا۔ انہوں نے سندھ کے کئی شہروں بشمول خیر پور، سانگھڑ، تھرپارکر، حیدرآباد اور نواب شاہ میں حر مراکز قائم کیے۔ برطانوی حکومت نے حروں کے خلاف لڑنے کے لیے بلوچستان اور پنجاب سے لوگوں کو جمع کیا اور سندھ کے ان اضلاع میں رہائش بھی دی جہاں حروں کے مراکز موجود تھے۔ انگریزوں کے اس عمل نے حروں کی جڑوں کو کمزور کردیا اور حکومت نے کئی حروں کو گرفتار کر کے ان پر غداری کا مقدمہ چلا کر شہید کردیا۔[3]

شاہ مردان شاہ کو کوٹ دھنی کا لقب بھی دیا گیا۔ پیر شاہ مردان شاہ کی وفات 9 نومبر، 1921 کو ہوئی تھی۔[4]

حروں کی تاریخ کا چوتھا اور آخری مرحلہ

سید شاہ مرادان شاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید صبغت اللہ شاہ ثانی چھٹے پیر پگارا بنے۔ پیر پگارا صبغت اللہ شاہ 2 مارچ، 1909 کو پیدا ہوئے اور چھوٹی عمر میں ہی انہیں روحانی پیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔

پیر صبغت اللہ شاہ ثانی ابھی 12 سال کے ہی ہوئے تھے کہ ان کے دل میں وطن کے لیے محبت اور جنون پیدا ہوا۔ انہوں نے پھر سے حر جماعت اور سندھی قوم کو برطانوی افسروں کے ظلم، توہین اور ذلت آمیز رویے کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے منظّم کیا۔ پیر صبغت اللہ شاہ نے مکی جنگل سانگھڑ میں اپنا مرکز قائم کیا تاکہ زمینی فوج آسانی سے حملہ نہ کرسکے اور برطانوی حکومت ان کی جدوجہد میں روکاوٹ نہ ڈال سکے۔ صبغت اللہ شاہ نے اپنے بنگلے کو جسے گڑنگ بنگلا کہا جاتا تھا، مرکز بنایا جہاں وہ اپنے مریدوں کو بھرتی کرکے انہیں تربیت دیتے تھے۔ اس مسلح جدوجہد کا نعرہ ''گھر، زمین یا موت'' تھا۔ برطانوی حکومت نے حر تحریک کو کچلنے کے لیے مارشل قانون نافذ کیا۔ 1930 میں برطانوی حکومت نے صبغت اللہ شاہ کو جھوٹے مقدمات میں گرفتار کرلیا اور انہیں ہندوستان کی رتنا گری، مدناپور اور علی پور اور دیگر جیلوں میں آٹھ سال قید میں رکھا گیا۔

حروں نے برطانوی حکومت کو مفلوج کرنے اور اپنے روحانی پیشوا کی رہائی کے لیے تھانوں، سرکاری عمارتوں، ریلوے اسٹیشنوں، ٹیلی فون کے نظام اور آبپاشی نظام پر حملے کرنا شروع کردیئے۔ 1939 میں پیر صبغت اللہ شاہ ثانی نے رہائی ملنے کے بعد انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور تیز کردی۔

حر جب انگریز فوج یا پولیس پر حملہ کرتے تھے تو بھیج پگارا بھیج پگارا کا نعرا بلند کرتے تھے جو آج بھی عام ہے۔ برطانوی حکومت نے 1941 میں پیر صبغت اللہ شاہ کو پھر گرفتار کرلیا اور حر تحریک کچلنے کے لیے انگریزوں نے 1941 میں گڑنگ بنگلہ اور حروں کے دیگر مراکز پر بمباری کردی۔ 6 ستمبر، 1942 برطانوی حکومت نے درگاہ شریف کی چار دیواری اور بنگلے کو مسمار کرکے ساری ملکیت بشمول سونا، چاندی اور قیمتی سامان اور ہزاروں کتابیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس دوران پیر پگارا کے ہزاروں حروں کو شہید کیا گیا۔ یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس دور میں سندھ کے با اثر لوگوں نے بھی پیر صاحب کا ساتھ نہیں دیا۔ کچھ عرصے بعد انہیں حیدرآباد سینٹرل جیل منتقل کردیا۔ برطانوی حکومت نے 20 مارچ 1943 کو پیر

سید صبغت اللہ شاہ عرف سوریہ بادشاہ کو حیدرآباد سینٹرل جیل میں پھانسی دے دی اور ان کا جسد خاکی ورثا کے حوالے کرنے کے بجائے غائب کردیا گیا۔ پیر صبغت اللہ شاہ اور ان کے پیروکاروں نے برطانوی حکمرانوں کے خلاف اور ان کے حامیوں کے خلاف 1921 سے 1943 تک آزادی کی جنگ لڑی یعنی 23 سال جدوجہد کی۔[5]

سید صبغت اللہ شاہ کے بیٹے پیر سکندر شاہ عرف شاہ مردان شاہ ثانی 22 نومبر، 1928 کو خیرپور میں واقع اپنے آبائی گاؤں پیر جو گوٹھ میں پیدا ہوئے۔ پیر سکندر شاہ عرف شاہ مردان شاہ ثانی اپنے والد سید صبغت اللہ شاہ ثانی کی وفات کے بعد ساتویں پیر پگارا تھے۔ پیر سید شاہ مردان شاہ ثانی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں پیر جو گوٹھ میں حاصل کی۔ پیر صاحب ابھی دو سال کے ہی تھے جب ان کے والد پیر صبغت اللہ شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا۔ پیر صبغت اللہ شاہ کو پھانسی دینے کے بعد برطانوی حکومت نے پیر سکندر علی شاہ اور ان کے خاندان پر سخت پابندیاں عائد کردیں اور ان کو کراچی کے موجودہ محمد علی جناح روڈ کے ایک بنگلے میں کچھ عرصے کے لیے نظر بند کردیا۔ اس کے بعد انہیں وہاں سے علی گڑھ منتقل کردیا گیا جہاں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے مزید تعلیم حاصل کی۔ پاکستان بننے سے ایک سال پہلے یعنی 1946 میں پیر صاحب اور ان کے خاندان کو ایک بحری جہاز کے ذریعے برطانیہ بھیجا گیا جہاں سے انہوں نے مزید تعلیم حاصل کی۔ میجر ڈیوس لیورپول نے برطانیہ میں انہیں دوران تعلیم انگریزی، فارسی اور لاطینی زبان سکھائی۔ قیام پاکستان کے بعد 1949 میں ملک کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان برطانیہ کے دورے پر گئے جہاں انہیں پیر صاحب اور ان کے بھائی نادر علی شاہ سے ملوایا گیا۔ لیاقت علی خان نے انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ پاکستان آنے کے بعد حر جماعت پھر سے منظّم ہوئی اور 4 فروری، 1952 میں شاہ مردان شاہ ثانی کی پیر پگارا کے طور پر دستار بندی کی گئی اور پیر صاحب کو حروں کا پیشوا مقرر کیا گیا۔ حر جماعت کے خلاف جن لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کی حمایت کی پیر صاحب نے ان سب کو سزا دینے کے بجائے عام معافی کا علان کیا۔

پیر پگارا کی رشتہ داریاں

پاکستان آنے کے بعد پیر سید سکندر علی شاہ عرف شاہ مردان شاہ ثانی پیر پگارا نے پہلی شادی پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے چچا مخدوم غلام میران شاہ کی بیٹی سے کی۔ یاد رہے کے مخدوم غلام میران شاہ رحیم یار خان کے ایک بڑی جاگیردار بھی ہیں۔ اس طرح مخدوم غلام میراں شاہ سے رشتہ داری سے پیر صاحب پگارا کے اثر ورسوخ میں اور بھی اضافہ ہوا۔ پیر پگارا کو پہلی بیوی سے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ پہلے بیٹے کا نام پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی سوئم ہے جو موجودہ یعنی آٹھویں پیر پگارا ہیں، دوسرے بیٹے کا نام پیر سید علی گوہر شاہ راشدی سوئم ہے اور تیسرے بیٹے کا نام پیر سید صدر الدین شاہ راشدی ہے۔ پیر صدر الدین شاہ مسلم لیگ (ف) کے جنرل سیکریٹری بھی ہیں۔

پیر صاحب شاہ مردان شاہ ثانی کی بیٹی کی شادی پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما آغا سراج درانی سے ہوئی۔ آغا سراج درانی موجودہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر ہیں۔ آغا سراج درانی کے والد آغا صدر الدین درانی بھی 1970 سے 1977 تک ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں سندھ اسمبلی کے اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر بھی رہ چکے ہیں۔ پیر صاحب پگارا کی پوتی پیر صدر الدین شاہ کی بیٹی کی شادی پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹے عبد القادر گیلانی سے ہوئی۔ عبدالقادر شاہ گیلانی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 2008 میں ملتان سے کیا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کے پیر پگارا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی آپس میں رشتہ داریاں اور گہرے تعلقات ہیں۔ پیر صاحب پگارا نے دوسری شادی اپنے رشتے داروں میں کی تھی جس سے ایک بیٹا سید حزب اللہ شاہ اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

پیر صاحب پگارا کی سیاسی زندگی

پیر صاحب پگارا نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے دور سے کیا۔ انہوں نے ایوب خان کے شہداد پور، سندھ میں ہونے والے عوامی جلسہ عام میں پہلی بار خطاب کیا اور سیاست میں داخل ہوگئے۔ یہ جلسہ عام میونسپل ہائیر اسکول کے میدان میں ہوا۔ 1965 کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی ایوب خان کے مقابلے میں شکست کے بعد محترمہ فاطمہ جناح نے مسلم لیگ فنکشنل کے قیام اور پیر صاحب پگارا کو اس کا سربراہ بنانے کا علان کیا۔ انہیں متحدہ مسلم لیگ کا پہلا صدر بھی نامزد کیا۔ پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو بھی پیر صاحب کے گہرے دوست تھے لیکن جب بھٹو مرحوم نے جنرل ایوب خان کے خلاف تحریک چلائی تو بھٹو اور پیر صاحب پگارا کے راستے الگ ہوگئے۔

پیر صاحب پگارا نے ہمیشہ فوجی حکمرانوں کی حمایت کی، یہی وجہ ہے کے ملک میں جب ضیاالحق نے مارشل لاء نافذ کیا تو پیر صاحب پگارا نے سیاسی حکومت بنانے کی کوشش کی اور جنرل ضیاالحق نا صرف سیاسی رہنماؤں سے بات کرنے پر آمادہ ہوئے بلکہ ملک کو جمہوریت کی ''پٹری'' پر ڈالنے کا وعدہ بھی کیا۔ مارشل لاء کے خاتمے کے بعد عام انتخابات کی راہ ہموار ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم ہوئی اور محمد خان جونیجو، میاں محمد نواز شریف کو وزارت عظمیٰ تک پہنچنے کا موقع ملا۔

پیر صاحب پگارا جی ایچ کیو سے تعلق کے اظہار میں کبھی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ سندھ میں وزیراعلیٰ کے منصب تک پہنچنے والے سید غوث علی شاہ نے بھی پیر پگارا کی سیاسی بصیرت کو استعمال کیا تھا۔ پیر پگارا سے ان کے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کے آپ نے پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے لیے اپنے برادر نسبتی مخدوم حسن محمود (مرحوم) کے بجائے نواز شریف کی حمایت کیوں کی تھی تو انہوں نے جواب دیا کے ''پنجاب کے بارے میں فیصلہ تو جنرل ضیاالحق کو کرنا تھا اور انہوں نے ہی یہ انتخاب کیا تھا البتہ بلوچستان میں وزیراعلیٰ بنانے کے لیے میں نے جام صاحب لسبیلہ کا نام پیش کیا تھا جو وزیراعلیٰ بن گئے تھے''۔6

بھارت کے خلاف 1965 کی جنگ میں حر جماعت پاکستانی افواج کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی فوج تھل کی سرحد پر نہیں تھی کیونکہ پیر صاحب نے 20,000 ہزار سے زیادہ حر پاکستانی افواج کی مدد کے لیے فراہم کردیے تھے۔ بھارت کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں پاکستان کی فتح ہوئی۔ سندھ کے وسیع صحرا سے حروں کے لیے حملہ کرنا بہت آسان تھا۔ اس جنگ کے بعد پیر صاحب پگارا اور پاکستانی فوج کے تعلقات اور بھی گہرے ہوگئے۔ پاکستان میں سیاسی ہلچل پیر صاحب کے کنگری ہاؤس میں ہوتی تھی۔ سندھ میں پیر صاحب پگارا کا نام تمام پیروں میں اول درجے پر ہے۔ ان کے پیروکار آج بھی پاکستان اور بھارت میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔7

پیر سکندر علی شاہ پیر پگارا کا انتقال 83 سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے لندن میں 10 جنوری، 2012 کو ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پیروکار پورے پاکستان اور بھارت سے درگاہ پیر جو گوٹھ میں جمع ہوگئے اور آخری رسومات کے بعد جماعت اور خلیفہ کے فیصلے کے مطابق ان کے بڑے بیٹے پیر صبغت اللہ شاہ سوئم عرف راجہ سائیں کو آٹھواں پیر پگارا بنایا گیا۔8

پیر صبغت اللہ شاہ سوئم 14 فروری، 1956 کو پیدا ہوئے۔ پیر پگارا راجہ سائیں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1983 میں کیا تھا۔ پیر پگارا راجہ سائیں خیرپور ضلع کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ اس کے علاوہ سندھ اسمبلی کے تین بار رکن بھی رہ چکے ہیں۔ انہیں سندھ کا آبپاشی کا وزیر بھی بنایا گیا۔ مسلم لیگ (ف) کا صدر بھی بنایا گیا۔ 1985 میں پیر صاحب پگارا راجہ سائیں غیر جماعتی بنیاد پر ہونے والے عام انتخابات میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔ 1988 کے عام انتخابات میں انہیں پیپلز پارٹی کے امیدوار غلام قادر شاہ کے چھوٹے بیٹے علی تقی شاہ نے پیر جو گوٹھ کے حلقے سے شکست دی تھی۔ تاہم پیر پگارا راجہ سائیں کو سانگھڑ سے منتخب کیا گیا۔ 1990 کے انتخابات میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے امیدوار منظور وسان کے بڑے بھائی رحیم بخش وسان کو شکست دے کر پیر جو گوٹھ کی نشست حاصل کرلی۔

مئی 2004 میں مسلم لیگ (ف) نے مسلم لیگ (ق) سے اتحاد کرلیا۔ تاہم جولائی 2004 میں دو ماہ بعد ہی پیر صاحب پگارا اور مسلم لیگ (ق) کے چودھری برادران کے ساتھ اختلافات کے بعد دونوں جماعتیں الگ ہوگئیں۔

2008 کے عام انتخابات میں مسلم لیگ (ف) نے قومی اسمبلی کی چار نشستیں جیتیں اور انہیں عورتوں کی ایک مخصوص نشست بھی دی گئی۔ اس طرح ان کی جماعت نے قومی اسمبلی سے پانچ، سندھ اسمبلی سے آٹھ اور پنجاب اسمبلی سے تین نشستیں جیت لیں۔

ستمبر 2010 مسلم لیگ (ق) مسلم لیگ (ف) اور آل پاکستان مسلم لیگ متحد ہوگئے۔ جنوری 2012 میں پاکستان مسلم لیگ (ف) کے سربراہ پیر سکندر علی شاہ کے انتقال کے بعد پیر صاحب پگارا راجہ سائیں کنگری ہاؤس میں منتقل ہوگئے۔ 2013 کے عام انتخابات میں مسلم لیگ (ف) نے قومی اسمبلی سے چھ اور صوبائی اسمبلی سے 10 نشستیں حاصل کیں۔ پیر صاحب پگارا راجہ سائیں کے بھائی سید صدرالدین شاہ کو سمندر پار پاکستانیوں کا وزیر بھی مقرر کیا گیا تھا۔

یاد رہے کے پیر پگارا راجہ سائیں کے اپنے نام پر کئی گھر ہیں جن کو راجہ ہاؤس کا نام دیا گیا ہے۔ پیر پگارا راجہ سائیں اپنا سیاسی کام کنگری ہاؤس میں کرتے ہیں جب کہ ان کے گھر والے راجہ ہاؤس اور پگارا ہاؤس میں رہتے ہیں۔ پیر پگارا راجہ سائیں کے پاکستان کے کئی شہروں میں کئی بنگلے موجود ہیں۔

پیر پگارا راجہ سائیں کی رشتہ داریاں

پیر پگارا راجہ سائیں کی پاکستانی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی شخصیات سے رشتہ داریاں ہیں۔ مخدوم احمد محمود اور سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ مخدوم احمد محمود کے والد مخدوم حسن محمود پیر پگارا راجہ سائیں کے ماموں تھے اور یوسف رضا گیلانی کے نانا اور جہانگیر ترین کے سسر۔ مخدوم احمد محمود (یعنی پیر پگارا راجہ سائیں کے سگے ماموں زاد بھائی) کی رشتہ داریاں بھی پاکستان کے کئی بڑے بڑے سیاستدانوں سے ہیں۔ سابق وفاقی وزیر صحت تسنیم نواز گردیزی مخدوم احمد محمود کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان تحریک انصاف کے مرکزی رہنما جہانگیر ترین مخدوم احمد محمود کے بہنوئی ہیں۔9

پیر پگارا راجہ سائیں کی پہلی شادی سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی چچا زاد بہن سے ہوئی تھی۔ بعد میں ان کے والد پیر صاحب پگارا نے 1992 میں انہیں طلاق دلوائی تھی۔ پیر راجہ سائیں نے دوسری شادی متحدہ عرب امارات کی ایک خاتون سے کی۔ راجہ سائیں کے چار بیٹے ہیں۔ پہلے بیٹے کا نام پیر سید راشد شاہ، سید عمر مصطفیٰ، سید ابوبکر شاہ اور سید عثمان شاہ ہیں۔ تاہم سیاست میں ان کے دو بیٹے سید راشد شاہ اور سید عمر مصطفیٰ شاہ سرگرم نظر آتے ہیں۔10

پاکستان میں عام انتخابات ہوں یا بلدیاتی انتخابات ملک میں تصادم کے

واقعات ہوتے ہیں۔ سندھ میں بھی مسلم لیگ (ف) اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں تصادم معمول کی بات ہے۔مثال کے طور پے 2015 کے بلدیاتی انتخابات میں رانی پور میں درازا شریف کے قریب پاکستان مسلم لیگ (ف) اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان گولیوں کے تبادلے میں 12 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔11

2013 کے عام انتخابات میں کمنب، خیر پور میں بھی مسلم لیگ (ف) اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں۔ اس تبادلے میں بھی تین افراد اپنے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس سیاسی دشمنی کی وجہ سے کئی گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہوگئے اور کئی بے گناہ لوگوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔12 یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان جماعتوں کے سربراہوں کے درمیان گہری رشتے داریاں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ بظاہر سیاسی دشمنیاں بھی۔ یہ سمجھ سے باہر ہے کہ دشمنیوں کے باوجود رہنماؤں کے گھر آباد رہتے ہیں جبکہ دونوں جماعتوں کے کارکنان جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

خیر پور کے مقامی لوگوں کے مطابق پیر پگارا کی گئی ''کیٹیاں'' ہیں جو خیر پور کے کچے کے علاقے میں موجود ہیں۔ ایک کیٹی میں کئی ہزار ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ پیر صاحب پگارا نے کیٹیاں اپنے بیٹوں کے نام پر منتقل کی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر کچے میں صدر الدین شاہ، علی گوہر شاہ اور حزب اللہ شاہ کے نام پر الگ الگ کیٹیاں ہیں۔ خیر پور کے علاوہ سانگھڑ حیدرآباد، تھل اور سندھ کے دیگر اضلاع میں بھی ان کی زمینیں ہیں۔ مقامی لوگوں سے حاصل کی ہوئی معلومات کے مطابق پیر پگارا کی زمینوں پر کام کرنے والے مریدین کے علاوہ اکثر مزدور ہوتے ہیں جن سے اجرت پر کام کروایا جاتا ہے۔ پگارا خاندان کی زمینوں پر آدھے پر کام کرنے والے کسان کم پائے جاتے ہیں۔13

قریشی پیر جاگیردار

انگریزوں نے اس سرزمین پر جب قدم رکھا تو یہاں لوگ دو طبقات میں بٹ گئے۔ ایک طبقے نے انگریز کو ''کافر'' اور ''دجال'' قرار دے کر اس کے خلاف علم جہاد بلند کردیا۔ دوسرے طبقہ نے اس کی خدمت و خوشامد کو اپنا شعار بنایا۔ پہلے طبقے کو اپنے عقیدے کی سزا بھگتنا پڑی اور انگریزوں نے ان کے رہنماؤں کو توپوں کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ دوسرا طبقہ فائدے میں رہا جس نے دین فروشی کے عوض بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں انعام میں پائیں۔ گورمانیوں اور گیلانیوں کی طرح ملتان کے مخدوم قریشیوں کا شمار بھی اسی طبقے میں ہوتا ہے۔14

شاہ محمود قریشی 22 جون، 1956 میں مخدوم سجاد حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ قریشی خاندان کا پاکستان کے معتبر مذہبی خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم سجاد حسین کا سلسلہ نسب مخدوم بہاؤ الدین ذکریا سے ملتا ہے۔15

سجاد حسین قریشی 24 ستمبر، 1923 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرید حسین تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مخدوم مرید حسین سیاست میں داخل ہو گئے اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1962 اور 1965 میں ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1970 کے انتخابات میں کامیاب نہ ہوسکے تاہم 1977 کے انتخابات سے پہلے انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی اور پارٹی ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ 1985 کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد مخدوم سجاد حسین قریشی سینٹ کے رکن اور ڈپٹی چیئرمین بنے۔ ملک سے مارشل لاء کے خاتمے کے بعد 30 دسمبر، 1985 کو صوبہ پنجاب کے گورنر بنا دیئے گئے۔ مخدوم سجاد حسین 23 جنوری، 1998 کو ملتان میں وفات پاگئے۔ انہیں ملتان میں حضرت بہاؤ الدین ذکریا کی درگاہ میں دفن کیا گیا ہے۔16

شاہ محمود قریشی نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور سے حاصل کی۔ گریجویشن کی ڈگری فارمین کرسچن کالج اور قانون کی ڈگری کیمرج یونیورسٹی سے حاصل کی۔

مخدوم شاہ محمود قریشی نے 1983 میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ اسی برس انہوں نے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ 1985 کے غیر جماعتی انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور 1986 میں پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ 1988 میں دوبارہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1990 کے عام انتخابات میں تیسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1993 میں شاہ محمود قریشی نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی اور ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور جاوید ہاشمی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔17

1997 میں شاہ محمود قریشی نے اسی نشست پر جاوید ہاشمی سے شکست کھائی۔ 2002 کے انتخابات میں پھر کامیاب ہوئے اور قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ محترمہ بینظیر بھٹو نے شاہ محمود قریشی کو پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر بنایا۔ 2008 کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد یوسف رضا گیلانی کو وزیر اعظم اور شاہ محمود قریشی کو وزیر خارجہ بنایا گیا۔ جنوری 2011 میں ایک امریکی جاسوس ریمن ڈیوس کو امریکہ کے حوالے کرنے کے معاملے پر شاہ محمود قریشی کے صدر آصف علی زرداری سے اختلافات ہو گئے۔ اس کے بعد شاہ محمود قریشی کو وزارت خارجہ کے عہدے سے فارغ کردیا گیا۔ نومبر 2011 میں شاہ محمود قریشی نے پاکستان تحریک انصاف میں شمولیت کا اعلان کردیا اور انہیں پاکستان تحریک انصاف کا وائس چیئرمین بنایا گیا۔18

مخدوم سجاد حسین کے چھوٹے بیٹے مخدوم زادہ مرید حسین قریشی نے 1988 میں پہلی مرتبہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے انتخابات

میں حصہ لیا مگر پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے امیدوار حاجی خلیل احمد شیخ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ 1990 کے انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیابی حاصل کی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1993 کے عام انتخابات میں اپنے بڑے بھائی کی طرح مخدوم زادہ مرید حسین نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور ملتان سے کامیاب ہوگئے۔ 1997 کے انتخابات میں انہوں نے اس نشست پر ملک مظہر عباس ران سے شکست کھائی۔ اس کے علاوہ قریشی خاندان کے اور بھی دیگر افراد پاکستان کی سیاست میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ سجاد حسین کے چچا شیخ احمد کبیر بھی اپنے زمانے کے معروف گدی نشین تھے۔ شاہ محمود قریشی کی شادی مہرین قریشی سے ہوئی ہے ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔[19] شاہ محمود قریشی نے اپنے اثاثوں کو ظاہر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ ان کے 15 بنگلے ہیں۔ کل زمین کی ملکیت ظاہر نہیں کی گئی لیکن صرف 89,000 روپے سالانہ زرعی ٹیکس دینے کا اعتراف کیا۔[20]

گیلانی خاندان

ملتان کے گیلانی خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کے یہ خاندان نہایت قدیم ہے اور ان کا نام ایران کے ایک صوبے گیلان سے منسوب ہے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید عبدالقادر شاہ گیلانی کی اولاد میں سے ہے۔ سید عبدالقادر شاہ گیلانی کی نویں پشت میں ایک بزرگ سید شیخ محمد غوص تھے جو پندرھویں صدی میں ریاست بہاول پور میں اچ کے مقام پر آکر آباد ہوئے۔ اسی مقام پر سید شیخ محمد غوث کے خاندان میں پیر موسیٰ پاک شہید پیدا ہوئے جو گیلانی خاندان کے جد امجد ہیں۔

پیر سید موسیٰ پاک شہید کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو بیٹے نواب سید یحییٰ اور نواب سید موسیٰ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں ملتان کے ناظم تھے۔ مغلیہ حکومت کی طرف سے درگاہ کے سجادہ نشین کو ساڑھے بارہ ہزار روپے کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ دیگر یہ کہ شہنشاہ محمد شاہ جب سید مخدوم شیخ محمد غوص ثانی سے ملنے آئے تو انہوں نے اس جاگیر میں مزید اضافہ کردیا۔ 1848 میں جب میجر ایڈورڈ نے ملتان فتح کیا تو درگاہ کے سجادہ نشینوں کی خیر خواہی سے متاثر ہوا اور درگاہ کے لیے یہ سند دی کہ اسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران مخدوم شیخ حامد گنج رابع المعروف پیر سید نور شاہ نے انگریزوں کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں چنانچہ ان کی قوم فروش خدمات کے عوض 1859 میں سر جان لارنس نے انہیں 300 روپے خلعت اور ایک سند عطا کی۔

پیر نور شاہ کے بعد ان کے خاندان کے باقی لوگوں نے بھی انگریزوں کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ انگریز حکومت اس وفاداری پر گیلانی خاندان کو کئی قیمتی تحائف اور اعزازات سے نوازا۔ مخدوم سید صدرالدین شاہ گیلانی موجودہ گیلانی خاندان کے سربراہ سید موسیٰ پاک کے بیٹے تھے جو انگریزوں کے وفادار رہے۔[21]

خان بہادر مخدوم صدر الدین شاہ کے دو بھائیوں میں سے ایک سید شیر شاہ سرکاری ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ایکسٹرا کمشنر بن گئے۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزی فوج میں رنگروٹ بھرتی کروائے جس کے صلہ میں ایک تمغہ، سنہری گھڑی، تلوار اور خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا۔ خان بہادر مخدوم صدر الدین کے چار بیٹے ہوئے جن کے نام سید غلام یٰسین شاہ، سید غلام مصطفیٰ شاہ، سید مختار حسین شاہ اور سید محمد رضا شاہ تھے۔ یہ تمام بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

سید غلام مصطفیٰ شاہ کے نو بیٹے تھے جن میں تین بیٹے یعنی سید ولایت حسین شاہ، سید علمدار حسین شاہ اور سید رحمت حسین شاہ سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ سید ولایت حسین شاہ اور سید علمدار حسین شاہ 1951 میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جبکہ سید علمدار حسین شاہ 1953 میں صوبائی وزیر صحت کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی دوران سید محمد رضا شاہ کے بیٹے سید حامد رضا گیلانی بھی سیاست کے میدان میں نمایاں ہونا شروع ہوئے اور 1962، 1965 دونوں انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور بھٹو کے کہنے پر ان کے پارلیمانی سیکرٹری کے عہدے پر فائض کیے گئے تھے۔ 1977 میں بھٹو کے زوال کے بعد حامد رضا گیلانی نے جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ مضبوط کیے۔ 1985 کے انتخابی عمل میں شریک ہوئے اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 2002 میں ان کے بیٹے سید حیدر رضا گیلانی نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا پر کامیاب نہ ہوسکے۔ یوسف رضا گیلانی علمدار حسین گیلانی کے بیٹے ہیں۔ علمدار حسین گیلانی نے 8 اگست، 1978 کو وفات پائی۔[22]

یوسف رضا گیلانی 9 جون، 1952 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ملتان میں حاصل کی اور 1970 میں فارمین کرسچن کالج سے ہائر سیکنڈری کی سند حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ سید یوسف رضا گیلانی کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالقادر گیلانی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 2008 سے کیا۔

یوسف رضا گیلانی کی سیاسی زندگی

یوسف رضا گیلانی نے 1978 میں سیاست کی دنیا میں قدم رکھا اور مسلم لیگ کی سینٹرل ورکنگ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1982 میں وفاقی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1983 میں سید فاخر امام کو شکست دے کر چیئرمین ضلع کونسل کے رکن منتخب کیے گئے۔ 1985 میں یوسف رضا گیلانی کو وفاقی وزیر برائے ہاؤسنگ بنایا گیا۔

اس عہدے پر وہ 1988 تک فائز رہے۔

اپریل سے لے کر جنوری 1986 میں وزیر اعظم پاکستان محمد خان جونیجو کی کابینہ میں پہلے ہاؤسنگ اور تعمیرات کے وزیر اور پھر جنوری 1986 سے دسمبر 1986 میں ریلوے کے وزیر منتخب ہوئے۔ 1988 میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی اور عام انتخابات میں نواز شریف کو شکست دے کر وفاقی کابینہ میں شامل ہوئے اور بینظیر بھٹو کی سربراہی میں رہائش و تعمیرات کی وزارت کا قلمدان سنبھلا۔ 1988 میں یوسف رضا گیلانی کو پاکستان پیپلز پارٹی کا وائس چیئرمین بنایا گیا۔

1990 میں تیسری مرتبہ قومی اسمبلی رکن منتخب ہوئے۔ 18 اپریل، 1993 کو غلام اسحاق خان نے قومی اسمبلی توڑ دی اور میر بلخ شیر مزاری کو نگراں وزیر اعظم بنادیا گیا۔ اس نگران کابینہ میں سید یوسف رضا گیلانی کو بلدیات کا قلمدان سونپا گیا۔[23]

1997 کے انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کے امیدوار سے شکست کھائی۔ 11 فروری، 2001 میں مشرف دور میں قید کردیے گئے۔ الزام یہ تھا کے آپ نے بحیثیت اسپیکر قومی اسمبلی اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے 600 نااہل لوگوں کو ملازمتیں دی جس سے حکومت پاکستان کو 30 ملین روپے کا نقصان ہوا۔ 8 جون، 2002 کو احتساب عدالت نے پانچ سال قید با مشقت اور 10 لاکھ روپے جرمانہ کی سزا سنائی۔ 18 ستمبر، 2004 کو سید یوسف رضا گیلانی کے خلاف اختیارات کے غلط استعمال پر نیب (NAB) نے ریفرنس دائر کیا۔

2008 کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ 4 مارچ 2008 کو یوسف رضا گیلانی کو پاکستان کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ 26 اپریل، 2012 میں یوسف رضا گیلانی کو سپریم کورٹ نے توہین عدالت کا مجرم قرار دیا۔

یوسف رضا گیلانی کی رشتہ داریاں

یوسف رضا گیلانی کی ایک بیٹی اور چار بیٹے ہیں۔ عبدالقادر گیلانی یوسف رضا گیلانی کے بڑے بیٹے ہیں اور سیاست میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ باقی تین بیٹوں کے نام علی قاسم گیلانی، علی موسیٰ گیلانی اور علی حیدر گیلانی ہیں۔[24]

یوسف رضا گیلانی کی والدہ مخدوم حسن محمود کی بیٹی ہیں جبکہ مخدوم حسن کی بہن کی شادی مسلم لیگ کے سابق سربراہ شاہ مردان شاہ (پیر صاحب پگارا) سے ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ یوسف رضا گیلانی کے بیٹے عبد القادر گیلانی کی شادی پیر صاحب پگارا کی پوتی سے ہوئی ہے۔ اس طرح سے واضح ہے کہ گیلانی خاندان، مخدوم حسین کا خاندان اور پگارا خاندان کے سیاسی تعلقات کے علاوہ گھریلو تعلقات بھی ہیں۔[25]

اس مضمون سے واضح ہے کہ ہمارے ملک میں مذہبی اثر و رسوخ رکھنے والے خاندانوں اور جاگیردار خاندانوں کے آپس میں گہری رشتے داریاں اور مراسم ہیں۔ پیر پگارا، مخدوم حسن محمود، گیلانی خاندان اور ترین خاندان کی آپس میں کئی شادیاں واضح ہیں کہ ان چاروں خاندان کے افراد پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ف) اور پاکستان تحریک انصاف میں اہم ترین عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کی اولادوں کی کئی نسلوں سے آپس میں شادیاں جاری ہیں۔ لیکن عوام ان خاندانوں کی مریدی بھی کرتی ہے اور ان کی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ مظالم میں بھی پستی ہے۔ یہ طبقے اپنی مذہبی، معاشی اور سیاسی طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور عوام کو جانتے بوجھتے جہالت کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں تاکہ یہ طبقہ کبھی اپنے حقوق کے لیے منظّم ہوکر جدوجہد نہیں کرسکے!

حوالہ جات

1. Malik, Adeel and Mirza, Rinchan Ali. "Religion, land and politics: shrines and literacy in Punjab." August 5, 2014. Accessed from http://webcache.googleusercontent.com/search?q=cache:http://www.isid.ac.in/~epu/acegd2014/papers/AdeelMalik.pdf

2۔ چودھری، تبسم۔ ''تزکرہ پیران پگارہ''۔ جولائی، 1975، صفحہ 94-84-132-134، 218-220۔

3۔ جعفری، عقیل عباس۔ ''پاکستان کے سیاسی وڈیرے''۔ جہانگیر بکس، اپریل، 2007۔ صفحہ 574۔

4۔ چودھری، تبسم۔ صفحہ 226-223۔

5. Sodhar, Zain-ul-Abdin, Shaikh, Abdul Ghani, and Sodhar, Khair-u-Nisa. "The Hur Movement a foundation for independent Muslim state." Grassroots Vol. 49, No II July-Decemeber, 2015. Accessed from http://sujo.usindh.edu.pk/index.php/Grassroots/article/view/2112/1854

6. Tunio, Hafeez. "Pir Pagara passes away: the political oracle goes silent." Express Tribune, January 11, 2012. Accessed from http://tribune.com.pk/story/319690/pir-pagara-passes-away-the-political-oracle-goes-silent/

7. Altaf, Zafar." Pir Pagara and the power he wields in Pakistan." South Asia Tribune. Issue No. 61, September 28 -October 10, 2003. Accessed from http://www.antisystemic.org/satribune/www.satribune.com/archives/sep28_oct10_03/opinion_drzafar.htm

8. Express Tribune. "New Pir Pagara appointed as PML-F president." Express Tribune, January 21, 2012. Accessed fromhttps://tribune.com.pk/story/325033/new-pir-pagara-appointed-as-pml-f-president/

9۔ صدیقی، وسیم۔ ''پنجاب کے نئے گورنر مخدوم احمد محمود ... ایک تعارف''۔ 25 دسمبر، 2012۔ http://www.urduvoa.com/a/pakistan-punjab-governor-mukhdoom-ahmed-mahmood/1571937.html

10. Tunio, Hafeez and Memon, Sarfaraz. "The 8th Pir Pagaro: after night-long session, HurJamaat selects Raja Saeen." Express Tribune, January 12, 2012. Accessed from http://tribune.com.pk/story/320400/sabghatullah-shah-rashdi-appointed-new-pir-pagara/

بقیہ حوالہ جات: زمیندار خدا، صفحہ 26 پر دیکھیں

بات تو سچ ہے مگر

مزدور کے لیے قانون سازی: کپاس چننے والی مزدور عورت نظر انداز

عالمی یوم مزدور کے موقع پر سندھ کمیونٹی فاونڈیشن کی جانب سے منعقد کیے گئے ایک سیمینار میں مقررین کا کہنا تھا سندھ انڈسٹریل ریلیشن ایکٹ (SIRA) 2013 کے نفاذ کے باوجود، جو زراعت اور ماہی گیری شعبے سے وابستہ افراد کو مزدور کا درجہ دیتا ہے، مزدوروں کے کام کے بدتر حالات، کم اجرت اور ان کے لیے سہولیات کی عدم دستیابی جیسے معاملات میں تاحال کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد، کپاس چننے والی عورتوں کو اس نئے قانون کے تحت مزدور تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ ضلع ٹیاری، سندھ کی کپاس چننے والی عورت شبانہ نور کے مطابق وہ سارا دن کپاس چنتی ہے اور صرف 150 سے 200 روپے کماپاتی ہے۔ زمیندار فی من 300 سے 400 روپے اجرت دیتا ہے اور ایک من کپاس ایک دن میں دو عورتیں مل کر ہی چن سکتی ہیں جس سے یہ رقم دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ سندھ کمیونٹی فاونڈیشن کے مطابق سانگھڑ، گھوٹکی، خیر پور، عمرکوٹ، ٹیاری اور میر پورخاص اضلاع میں پانچ لاکھ عورتیں اس شعبے سے منسلک ہیں۔ یہ عورتیں غیر رسمی طور پر صرف چنائی کے موسم میں کام پر رکھی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ قانون کے تحت جو مزدوروں کی کم سے کم مقرر کردہ اجرت 13,000 روپے ماہانہ کا ان کپاس چننے والی عورتوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے زرعی یونیورسٹی سندھ کے پروفیسر محمد اسماعیل قمبر کا کہنا تھا کہ کپاس کی فصل پر زہریلی ادویات کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے جو کپاس چننے والی عورتوں کی صحت کو بری طرح متاثر کرتی ہیں۔ حفاظتی اقدامات نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر عورتیں اور بچے جلد، سینہ اور دیگر امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ مقررین نے کپاس چننے والی عورتوں کے تحفظ کے لیے زہریلی ادویات کے استعمال پر پابندی اور مزدوروں کے حقوق کے لیے قانون سازی اور اس کے نفاذ کا مطالبہ بھی کیا۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 2 مئی، صفحہ 13)

وزارت خوراک کا 77 منصوبوں کے لیے 10 بلین روپے کا مطالبہ

وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق نے آئندہ بجٹ 17-2016 میں 57 نئے اور 20 جاری منصوبوں کے لیے 10 بلین روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ سرکاری دستاویز کے مطابق وزارت اور اس سے متعلقہ اداروں نے 2.1 بلین روپے 20 جاری منصوبوں، 6.3 بلین روپے 57 نئے منصوبوں اور 1.6 بلین روپے پانچ دیگر زیرغور منصوبوں کے لیے طلب کیے ہیں۔ تمام 82 منصوبوں پر 48.7 بلین روپے لاگت آئے گی جبکہ ان منصوبوں کے لیے بیرونی امداد 148.078 ملین روپے ہے۔ بجٹ سفارشات کے تحت سپارکو کے مواصلاتی سیارے کے ذریعے فصلوں کی نگرانی منصوبے کے دوسرے مرحلے کے لیے 11.267 ملین روپے، پانی کے انتظام کے وفاقی ادارے فیڈرل واٹر مینجمنٹ سیل کے چھ منصوبوں کے لیے 13.79 ملین روپے، بیج کی تصدیق کے وفاقی ادارے فیڈرل سیڈ سرٹیفکیشن اینڈ رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ کے لیے 479.3 ملین روپے، پودوں کے تحفظ کے محکمے ڈپارٹمنٹ آف پلانٹ پروٹیکشن کے لیے 60 ملین روپے اور ماہی گیری کے فروغ کے ادارے فشریز ڈیولپمنٹ بورڈ کے لیے 1281.8 ملین روپے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تجارتی بنیادوں پر زیتون کی کاشت کے لیے 541.07 ملین روپے، زرعی ترقیاتی پروگرام پر تحقیق کے لیے 500 ملین روپے طلب کیے گئے ہیں۔ گزشتہ سال بجٹ 16-2015 میں حکومت نے وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق کے لیے عوامی ترقیاتی منصوبوں کے تحت 16 جاری اور سات نئے منصوبوں کے لیے 1,500 ملین روپے مختص کیے تھے۔ (بزنس ریکارڈر، 20 مئی، صفحہ 9)

بائیوسیفٹی باڈی: بغیر مشاورت جینیاتی بیجوں کی منظوری

ایک خبر کے مطابق بیج کی اقسام کی منظوری کے لیے اس کی جانچ پڑتال کرنے والی نیشنل بائیوسیفٹی کمیٹی نے تین ہفتے پہلے اپنے چودھویں اجلاس میں گندم، گنا، مکئی، مٹر، آلو، کپاس اور سرسوں کے جینیاتی بیج کی منظوری دے دی ہے۔ کمیٹی کی طرف سے منظور کردہ زیادہ تر اقسام ان اداروں کی طرف سے جمع کرائی گئی تھیں جن کے سربراہ خود ٹیکنکل ایڈوائزری کمیٹی کے رکن ہیں۔ ان اداروں میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار بائیو ٹیکنالوجی اینڈ جینٹک انجینئرنگ (National Institute for Biotechnology and Genetic Engineering /NIBGE) فیصل آباد، سینٹرل کاٹن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ملتان، فارمین کرسچن کالج لاہور اور مونسانٹو، سنجنٹا اور ڈوپونٹ جیسی بین الاقوامی کمپنیاں شامل ہیں جنہوں نے اپنے جینیاتی بیج کی منظوری حاصل کی۔ نیشنل بائیوسیفٹی کمیٹی کے اجلاس میں سیکریٹری محکمہ موسمی تبدیلی سید عاکف احمد نے کمیٹی کو بتایا کہ ان پر جینیاتی اشیا کے بڑھتے ہوئے تجارتی فوائد کے پیش نظر عجلت میں فیصلہ سازی اور باقاعدہ طریقہ کار پر عمل نہ کرنے پر تنقید کی گئی۔ ڈائریکٹر جنرل محکمہ تحفظ ماحولیات (Pak-EPA) عرفان طارق کے مطابق اپنے گزشتہ اجلاس میں کمیٹی نے 119 زیرغور بیجوں میں سے 70 جینیاتی بیجوں کو

منظور کیا تھا۔ کمیٹی نے مونسانٹو اور ڈوپونٹ کو بائیوسیفٹی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بی ٹی مکئی کی آزمائشی کاشت کی منظوری دی تھی۔ تاہم حکومت نے اب یہ فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ تنقید کے باوجود کمیٹی نے اپنے چودھویں اجلاس میں جینیاتی تبدیلی کے تجربات، درآمد، کھیتوں میں آزمائش اور جینیاتی فصلوں کی تجارتی فروخت کی اجازت دی اور اس کے ساتھ ساتھ کپاس کی 22 اقسام کی بھی منظوری دے دی۔ این بی سی نے کچھ کمپنیوں کو ان کے جینیاتی بیج کی آزمائشی کاشت سے مستثنیٰ بھی قرار دیا۔ دستاویزات کے مطابق این بی سی، TAC (ٹی اے سی) کی سفارشات پر بیجوں کی منظوری دیتی ہے۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 20 مئی، صفحہ 11)

کھاد پر دی جانے والی زرتلافی اس سال بھی متاثر ہونے کا خدشہ

وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے بجٹ تقریر کے دوران کھاد پر دی جانے والی زرتلافی کا 50 فیصد اس سال بھی صوبوں سے وصول کرنے کا اعلان کیا ہے باوجود اس کے کہ پچھلے سال پنجاب کے سوا کسی بھی صوبے نے اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کی۔ کھاد پر دی جانے والی زرتلافی میں صوبے مجموعی طور پر 40 بلین روپے فراہم کرینگے۔ وزارت خوراک کے افسر کے مطابق پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کی طرف سے تعاون نہ کرنے پر انہیں پچھلے سال بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ وزارت نے خزانہ ڈویژن کو سفارش کی ہے کہ زرتلافی کی رقم صوبوں کے حصے سے براہ راست منہا کرلی جائے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 8 جون، صفحہ 11)

پنجاب کا بجٹ: زرعی شعبے کے لیے خطیر رقم مختص

پنجاب حکومت نے بجٹ 17-2016 میں زراعت اور اس کے ذیلی شعبے خوراک، مال مویشی، آبپاشی اور جنگلات کے لیے 147 بلین روپے کی خطیر رقم مختص کی ہے۔ اس رقم میں وزیر اعلیٰ پنجاب کے زرعی شعبے کو دیے جانے والے امدادی پیکج کے 50 بلین روپے بھی شامل ہیں جس کا اعلان اپریل میں کیا گیا تھا۔ صوبے نے وفاقی حکومت کی جانب سے کھاد پر دی جانے والی زرتلافی میں پنجاب کا 11.60 بلین روپے کا حصہ بھی اسی پیکج سے دینے کی منصوبہ بندی کی ہے۔ صوبائی حکومت 17.70 بلین روپے کسانوں کو زرتلافی دینے پر خرچ کرے گی جس میں سے سات بلین روپے صوبے بھر میں ٹیوب ویلوں پر دی جانے والی زرتلافی پر خرچ ہونگے۔ 1.80 بلین روپے لینڈ لیولر، ٹریکٹر، ہارویسٹر اور بلڈوزر کے فروغ اور ان پر زرتلافی پر خرچ ہونگے۔ اسی طرح کپاس کے بیج کے منصوبے کاٹن سیڈ ریفارم پروگرام کے لیے تین بلین روپے جبکہ قطرہ قطرہ آبپاشی اور ٹنل فارمنگ پر بھی 2.50 بلین روپے زرتلافی دی جائے گی۔ بقیہ 10 بلین کی رقم 25 جاری اور 14 نئے منصوبوں پر خرچ کی جائے گی جن میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد بائیو ماس سینٹر، دیپالپور میں یونیورسٹی کیمپس، اہم فصلوں کی اقسام اور زرعی ادویات کی جانچ کرنے والی لیباٹری کے منصوبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شعبہ آبپاشی میں 41 بلین، مال مویشی پانچ بلین، جنگلات 1.2 بلین اور محکمہ خوراک کے جاری اور نئے منصوبوں کے لیے 865 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ (ڈان، 14 جون، صفحہ 2)

ملٹری فارم انتظامیہ اور کسانوں کے درمیان تصادم، چار افراد زخمی

پاکپتن میں گندم کی کٹائی کے معاملے پر بیل گنج ملٹری فارم انتظامیہ اور انجمن مزارعین پاکپتن کے نمائندوں کے درمیان ہونے والے تصادم میں دو عورتوں سمیت چار افراد زخمی ہوگئے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ملٹری فارم انتظامیہ، پولیس اور ایلیٹ فورس کے اہلکاروں نے مزارعین کو بیل گنج ملٹری فارم سے منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج، ہوائی فائرنگ اور آنسو گیس کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں چار کسان زخمی ہوگئے جنھیں بنگا حیات ہسپتال منتقل کردیا گیا۔ انجمن مزارعین پاکپتن کے صدر بصیر احمد کا کہنا تھا کہ انہوں نے گندم کی کٹائی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ سے حکم امتناعی لیا تھا لیکن ملٹری فارم انتظامیہ زبردستی گندم کی کٹائی کرنا چاہتی تھی۔ ذرائع کے مطابق تصادم اس وقت شروع ہوا جب ملٹری فارم انتظامیہ گندم کی کٹائی کے لیے بھاری مشینری لے کر آئی جس کے بعد کسان جمع ہوگئے اور انتظامیہ کو گندم کی کٹائی سے روک دیا جس پر تلخ کلامی کے بعد تصادم ہوگیا۔ فارم انتظامیہ نے پولیس طلب کرلی جس نے ایلیٹ فورس کے ساتھ انجمن مزارعین پاکپتن کے 30 نمائندوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج کیا۔ اطلاعات کے مطابق کسانوں کو منتشر کرنے کے بعد انتظامیہ نے گندم کی کٹائی جاری رکھی۔ (ڈان، 18 جون، صفحہ 2)

ڈیم کی تعمیر: مقامی لوگوں کے روزگار اور ماحول کی تباہی

تھرپارکر ضلع کے رہائشیوں نے تھرکول منصوبے کے تحت پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ڈیم کی تعمیر کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی ہے۔ یہ ڈیم تعلقہ اسلام کوٹ میں دیہہ گھرانو، تھر بلاک II میں سندھ اینگرو کول مائننگ کمپنی کی جانب سے تعمیر کیا جارہا ہے جس میں کوئلے کی کانکنی ممکن بنانے کے لیے زمین سے نکالا گیا پانی ذخیرہ کیا جائے گا۔ درخواست گزاروں کا موقف ہے کہ 2,700 ایکڑ زمین پر تعمیر کیا جانے والا مجوزہ ڈیم مقامی ماحولیات اور آبادیوں کے روزگار کو بری طرح متاثر کرے گا۔ ڈیم کی تعمیر سے 15 دیہات کی 15,000 افراد پر مشتمل آبادی، ان کی زرعی زمینیں، تقریباً 20,000 مویشی، 20,000 درخت، 20 پانی کے کنویں اور

10 تالاب متاثر ہونگے۔ درخواست گزاروں کے مطابق وہ چھوٹے کسان ہیں۔ گزشتہ ماہ حکومت نے انہیں زمین کاشت کرنے سے روک دیا ہے اور انہیں گھر اور زمین خالی کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ کسانوں کا کہنا ہے کہ ان کی زمین پر قبضہ، زمین کے حصول کے قانون لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1984 کی خلاف ورزی ہے۔ درخواست میں عدالت سے اپیل کی گئی ہے کہ ڈیم کی تعمیر کو ناقابل عمل، غیر قانونی اور ماحول دشمن قرار دیا جائے اور انہیں ہراساں کرنے کا عمل بند کیا جائے۔ تاہم اپیل کنندہ کی جانب سے مقدمے کے فیصلے تک ڈیم کی تعمیر کے خلاف حکم امتناعی جاری کرنے کی درخواست مسترد کردی گئی۔ عدالت نے تمام فریقین کو چار جولائی کو عدالت میں پیش ہونے کے لیے نوٹس جاری کردیے ہیں۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 2 جولائی، صفحہ 15)

پلانٹ بریڈرز رائٹس بل 2016 قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی میں منظور

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قومی غذائی تحفظ وتحقیق نے پودوں کی نئی اقسام کی تیاری کو فروغ دینے اور انہیں تیار کرنے والوں (بریڈرز) کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے پلانٹ بریڈرز رائٹس بل 2016 کی منظوری دے دی ہے جسے اب قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ وفاقی وزیر قومی غذائی تحفظ وتحقیق سکندر حیات خان بوسن کے مطابق یہ بل پودوں کی نئی اقسام تیار کرنے والوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنائے گا اور غذائی تحفظ کے حصول کے لیے بیج کی مستحکم صنعت کے لیے مددگار ہوگا۔ دونوں ایوانوں سے بل کی حتمی منظوری کے بعد بیرونی سرمایہ کار اس شعبے میں سرمایہ کاری کے لیے پاکستان آئینگے کیونکہ یہ بل ان سرمایہ کاروں کو قانونی تحفظ فراہم کرے گا اور اس بل کی حتمی منظوری زرعی شعبے میں ایک انقلاب ہوگا۔ وفاقی سیکریٹری برائے وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق محمد عابد جاوید نے بل کی نمایاں خصوصیات بتاتے ہوئے کہا ہے کہ بل کے مقاصد میں بیج اور پودوں کے نجی اور سرکاری اداروں کی تحقیق اور نئی اقسام کی تیاری کی حوصلہ افزائی کرنا، سبزیوں اور آرائشی فصلوں کی اعلی اقسام تیار کرنا اور نئی تکنیک اور غیرملکی اقسام کو تحفظ دینے کے لیے سہولت فراہم کرنا شامل ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ وفاق ایک تصدیق و انداراج کا محکمہ یعنی رجسٹری قائم کرے گا جو وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق کے ماتحت ہوگی۔ پودوں کی نئی اقسام کی تصدیق و اندراج، تصدیق نامے کا اجراء، ملکیتی حقوق کے حامل (پروٹیکٹڈ) پودوں کی اقسام کی تصدیق یقینی بنانا، نئی اقسام کی تیاری کو فروغ دینا، کسانوں اور پودوں کی افزائش کرنے والوں (بریڈرز) کے حقوق کا تحفظ کرنا، پودوں کی اقسام سے متعلق اعداد وشمار جمع کرنا اور رجسٹری کی ذمہ داریوں کو موثر طریقے سے جاری رکھنے کے لیے ضروری اقدامات کرنا اس رجسٹری کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگا۔ وفاقی حکومت ایک پلانٹ پروٹیکشن ایڈوائزری کمیٹی قائم کرے گی جو نجی اور سرکاری شعبے کے متعلقہ ماہرین پر مشتمل ہوگی۔ یہ کمیٹی وزارت اور رجسٹرار کو تجاویز فراہم کرے گی۔ نئی اقسام کو تحفظ حاصل ہوگا اگر وہ مطلوبہ معیار پورا کرتی ہوں۔ کسی نئی قسم کے اندراج اور تصدیق کے لیے درخواست کے ساتھ اس کی مکمل شناخت، افزائش کی تاریخ، اس قسم کے نئے اور مختلف ہونے کی جانچ کے لیے اس کی تصویر، درخواست گزار کی جانب سے یہ حلف نامہ جس میں قرار دیا جائے کہ اس قسم میں ایسا کوئی جین یا جینیات شامل نہیں ہے جو ٹرمینیٹر ٹیکنالوجی سے ہو۔ اس کے علاوہ جینیاتی تبدیلیوں کی حامل اقسام کے لیے نیشنل بائیوسیفٹی کمیٹی کا تصدیق نامہ ضروری ہوگا۔ (بزنس ریکارڈر، 10 اگست، صفحہ 12)

کھلے اور ڈبہ بند دودھ سے متعلق خطرناک حقائق کا انکشاف

حکومت کے مختلف اداروں کی جانب سے سپریم کورٹ میں منڈی میں دستیاب کھلے اور ڈبہ بند (ٹیٹرا پیک) دودھ اور بوتل بند پانی کے معیار کے حوالے سے رپورٹ جمع کروادی گئی ہیں۔ سیکریٹری پنجاب لائیو اسٹاک اینڈ ڈیری ڈیولپمنٹ کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ایک جرمن غیرملکی لیباٹری میں 2010 میں کرائے گئے 11 ڈبہ بند دودھ اور چائے کو سفید کرنے والے محلول کے کے تجزیے میں تمام نمونوں میں فارمل ڈی ہائیڈز (Formaldehydes) کی موجودگی کی تصدیق ہوئی ہے اور لیباٹری بھیجے جانے والے تمام نمونے ڈبہ بند (پیک) تھے۔ ادارے کی جانب سے جمع کرائی گئی رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ لیباٹری رپورٹ میں اس حوالے سے باقائدہ تجزیہ شامل نہیں ہے کہ آیا تمام مصنوعات ملکی اور غیرملکی معیار کے مطابق دودھ کی تعریف پر پوری اترتی ہیں یا نہیں کیونکہ لیباٹری رپورٹ میں دودھ میں پائے جانے والی غذائیت جیسے چربی، لحمیات اور شکر کا تعین نہیں کیا گیا جس سے یہ یقینی بنایا جاسکے کہ یہ تمام غذائیت معیار کے مطابق ہیں ی نہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ گیارہ نمونوں کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دودھ کے زمرے میں نہیں آتے لیکن انہیں اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ یہ قدرتی نظر آئے جس میں چربی کی مقدار زیادہ ہے۔ عدالت کی جانب سے گائے اور بھینسوں کو دودھ میں اضافے کے لیے لگائے جانے والے ٹیکوں کے حوالے سے کیے جانے والے سوال پر محکمے نے دعوی کیا ہے کہ آر بی ایس ٹی (Bovine somato tropin-rBST) ہارمون سوائے پنجاب کے ملک کے باقی حصوں میں استعمال کیا جارہا ہے۔ پنجاب حکومت نے اس ہارمون کا اندراج منسوخ کردیا ہے کیونکہ اس ہارمون کی انسانی جسم میں اضافی مقدار جان لیوا سرطان جیسے اثرات پیدا کرنے کی وجہ بن رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس ہارمون کے استعمال کی اجازت یورپ، جاپان اور کینیڈا میں نہیں مل سکتی۔ دودھ میں اضافے کے لیے ہارمون کے ٹیکوں کا استعمال انتہائی خطرناک ہے جس سے آخر

کارمویشی سرطان سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ پنجاب کے صحت اور طبی تعلیم کے خصوصی محکمے پنجاب اسپیشلائزڈ ہیلتھ کیئر اینڈ میڈیکل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے عدالت میں جمع کرائی گئی رپورٹ کے مطابق پاکستان کونسل آف ریسرچ ان واٹر ریسورسز (Pakistan Council of Research in Water Resources /PCRWR) بوتل بند پانی کی حیاتیاتی اور کیمیائی جانچ کررہا ہے۔ کونسل کی حالیہ رپورٹ کے مطابق تجزیے کے لیے 111 نمونے حاصل کیے گئے تھے جن میں سے 89 مکمل طور پر محفوظ، 22 غیر محفوظ، 92 کیمیائی طور پر محفوظ اور 19 کیمیائی طور پر غیر محفوظ تھے جبکہ دو نمونے حیاتیاتی اجسام کے حوالے سے غیر محفوظ تھے۔ دوران سماعت پنجاب فوڈ اتھارٹی کی ڈائریکٹر عائشہ ممتاز نے کہا کہ اتھارٹی نے حال ہی میں دو دودھ تیار کرنے والے کارخانوں کو سربمہر کردیا ہے۔ عدالت نے اتھارٹی کو غیر معیاری دودھ بنانے والی کمپنیوں کے خلاف کی گئی کارروائی کی رپورٹ اگلی سماعت پر پیش کرنے کی ہدایت کی ہے۔

(ڈان، 9 ستمبر، صفحہ 2)

پاکستان کو اضافی گندم کی برآمد میں ناکامی کا سامنا

اقتصادی رابطہ کمیٹی کی جانب سے گندم برآمد کرنے کی مدت میں بار بار توسیع کے باوجود عالمی منڈی میں گندم کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے پاکستان گندم برآمد کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کمیٹی نے حال ہی میں 120 ڈالر فی ٹن زرتلافی کے ساتھ گندم برآمد کرنے کی انتہائی تاریخ جنوری 2017 تک بڑھا دی ہے۔ اقتصادی رابطہ کمیٹی نے جنوری 2015 میں پنجاب کو 0.8 ملین ٹن گندم 55 ڈالر فی ٹن زرتلافی، اور سندھ کو 0.4 ملین ٹن گندم 45 ڈالر فی ٹن زرتلافی کے ساتھ برآمد کرنے کی اجازت دی تھی۔ گندم کی برآمد پر پنجاب اور سندھ حکومت بلترتیب 35 اور 45 ڈالر زرتلافی خود ادا کررہے تھے جس کے بعد مجموعی زرتلافی 90 ڈالر فی ٹن ہوگئی تھی۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق کمیٹی نے جنوری 2016 تک برآمدی دورانیے میں چار بار توسیع کی ہے۔ 16-2015 میں حکومت نے گندم کا ہدف 9.23 ملین ہیکٹر رقبے پر 26 ملین ٹن مقرر کیا تھا اور گندم کی خریداری کا ہدف 7.05 ملین ٹن مقرر کیا گیا تھا جبکہ رواں سال گندم کی خریداری کا ہدف 5.802 ملین ٹن ہے جس میں گزشتہ سال کا 4.1 ملین ٹن گندم مل کر ملک میں گندم کے ذخائر بڑھنے کا سبب بنے گا۔ اگر برآمد کے لیے فوری اقدامات نہ کیے گئے تو گندم ذخیرہ کرنے کی محدود سہولیات کی وجہ سے گندم خراب ہونے اور انسانی استعمال کے قابل نہ رہنے کا اندیشہ ہے۔ وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق نے وزارت خزانہ، پنجاب اور سندھ حکومت کو گندم کی برآمد پر زرتلافی کا ایک منصوبہ بھیجا ہے جس پر حکومت پنجاب کا کہنا ہے کہ وہ برآمد پر مزید 30 ڈالر زرتلافی وفاقی اور صوبائی حکومت کے درمیان 61:39 کے تناسب سے دینے کے حق میں ہے جبکہ سندھ حکومت نے 60:40 کے تناسب کی حمایت کی ہے۔ پنجاب حکومت نے مزید تجویز دی کہ چار اقساط میں دو ملین ٹن گندم کا آٹا ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (Trading Corporation of Pakistan /TCP) بزریعہ نیلامی فروخت کردے۔ وزارت خزانہ نے ان تجاویز کا جائزہ لینے کے بعد اس تجویز کی حمایت کی ہے کہ اقتصادی رابطہ کمیٹی کی جانب سے پہلے منظور کی گئی زرتلافی برقرار رکھی جاسکتی ہے اور اضافی زرتلافی کے لیے صوبے خود ادائیگی کرینگے جیسے کہ پہلے کرتے رہے ہیں۔

(بزنس ریکارڈر، 28 ستمبر، صفحہ 9)

بھوک کے خاتمے میں مدد کے لیے غذائی پالیسی کا حتمی مسودہ تیار

خوراک کے عالمی دن کے موقع پر پاکستان ایگری کلچرل ریسرچ کونسل (Pakistan Agricultural Research Council /PARC) کی جانب سے اس دن کی افادیت اجاگر کرنے اور زرعی شعبے پر موسمی تبدیلی اور اس کے اثرات کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے منعقد کی گئی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی وزیر قومی غذائی تحفظ وتحقیق سکندر حیات خان بوسن نے کہا ہے کہ ملک سے غربت کے خاتمے کے لیے غذائی پالیسی کے مسودے کو حتمی شکل دی جاچکی ہے۔ یہ مسودہ ارکان اسمبلی اور سماجی تنظیموں کے ارکان کی سفارشات شامل کرنے کے لیے انہیں پیش کیا گیا ہے تاکہ مسودے کو قابل عمل بنا کر ملک میں غذائی تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ وفاقی وزیر کا مزید کہنا تھا کہ اس سال خوراک کا عالمی دن ''موسم تبدیل ہورہا ہے، خوراک و زراعت کو بھی تبدیل ہونا چاہیے'' کے عنوان سے منایا گیا۔ غذائی پالیسی کے مسودے میں موسمی تبدیلی، قدرتی بحران، متنوع فصلوں اور غربت کے خاتمے پر توجہ مرکوز دی گئی ہے۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے فصلوں اور مال مویشی شعبے میں زیادہ پیداوار کا حصول قدرتی وسائل اور ماحول پر دباؤ کا باعث ہے جس کے نتیجے میں زیر زمین پانی میں تیزی سے کمی، زمین کی زرخیزی میں کمی اور اس کا بنجر ہونا اور جنگلات کا خاتمہ دیکھا گیا ہے۔ موسمی تبدیلی کے اثرات سے زرعی شعبہ متاثر ہے جو ملک کی 180 ملین آبادی کے غذائی تحفظ کی کوششوں کو بھی متاثر کررہا ہے۔ حکومت نے موسمی تبدیلی کے اثرات سے تحفظ کے لیے تیل کے استعمال کو کم سے کم کرنے اور شمسی توانائی سے چلنے والے ٹیوب ویل متعارف کروائے ہیں۔ اس کے علاوہ موسمی تبدیلی سے مطابقت رکھنے والی فصلوں کی کاشتکاری اور تکنیک استعمال کی جارہی ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 22 اکتوبر، صفحہ 11)

مونسانٹو پاکستان کا مکئی کی جینیاتی بیج ٹیکنالوجی کی نمائش

مونسانٹو پاکستان کی جانب سے لاہور کے قریب منگا منڈی میں آزمائشی کھیت میں جینیاتی ٹیکنالوجی اور زیادہ پیداوار دینے والے ہائبرڈ بیج کی پیداوار کا کسانوں کو مشاہدہ کروایا گیا جس میں صوبے بھر سے مکئی کاشت کرنے والے تقریبا 500 کسانوں نے شرکت کی۔ اس نمائش کا بنیادی مقصد کسانوں کو مونسانٹو کی نئی مصنوعات اور ٹیکنالوجی سے متعارف کروانا تھا۔ نمائش میں زراعت سے متعلق دیگر اشیا تیار کرنے والے اداروں جیسے شمسی پینل کے ذریعے توانائی پیدا کرنے والے، کھاد و سائلج تیار کرنے والے اور چھوٹے پیمانے پر قرضہ فراہم کرنے والے اداروں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر کمپنی کے ایشیا اور افریقہ میں فروخت کے نمائندے شارق بخاری کا کہنا تھا اس نئے بیج سے مکئی کی پیداوار میں بیماریوں اور کیڑوں کے حملے سے بچاؤ کے ذریعے 5 سے 10 فیصد اضافہ ممکن ہے۔ مونسانٹو ملک میں اب تک 20,000 سے زائد کسانوں، تعلیمی اداروں کے ماہرین، سائنسدانوں، طالبعلموں اور زرائع ابلاغ کے سامنے اپنے تجرباتی کھیتوں، نیشنل ایگریکلچر ریسرچ سینٹر اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں اس ٹیکنالوجی کی نمائش کر چکا ہے۔ مونسانٹو حکام کے مطابق نئی جینیاتی مکئی کو وزارت موسمی تبدیلی کی جانب سے فروری 2016 میں فروخت کی اجازت مل چکی ہے جبکہ جدید ٹیکنالوجی کی ہائبرڈ مکئی کی تجارتی طور پر درآمد وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق کی جانب سے اجازت کی منتظر ہے۔ مونسانٹو کے مطابق اس حوالے سے تمام قواعد پورے کیے جا چکے ہیں۔ 2009 میں پہلی تجرباتی کاشت کے نتیجے میں 2011 میں ان اقسام کی تجارتی فروخت کے لیے درخواست جمع کی گئی تھی اور جلد مکئی کی یہ اقسام منڈی میں دستیاب ہونگی۔ (بزنس ریکارڈر، 26 نومبر، صفحہ 5)

پاکستانی 50 فیصد عورتیں و بچے وٹامن، نمکیات کی کمی کا شکار

غیر سرکاری تنظیم مائیکرو نیوٹرنٹ انیشیٹو پاکستان کے مقامی ڈائریکٹر ڈاکٹر نصیر محمد نظامانی نے پاکستان میں غذائی کمی کی صورتحال پر ہونے والی ایک ورکشاپ میں کہا ہے کہ ملک میں 50 فیصد عورتیں اور بچے ضروری وٹامن اور نمکیات کی کمی کا شکار ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ سال سے کم عمر 45 فیصد بچوں کی اموات کی وجہ غذائی کمی ہے۔ ڈاکٹر نصیر کا مزید کہنا تھا کہ ''ایک بیمار اور کمزور قوم ملک پر بوجھ (لائبلٹی) اور اس کی ترقی میں رکاوٹ ہوگی جو بلآخر ملک کی مجموعی قومی پیداوار کو متاثر کرے گی''۔ بچوں کی ایک بڑی تعداد اپنی عمر کے مقابلے میں وزن کی کمی کا شکار ہیں اور یہ بچے اپنی عمر کے مطابق قد میں بھی کمی کا بھی شکار ہیں۔ اس وقت بچوں میں آیوڈین، وٹامن اے، فولاد، فولک ایسڈ اور زنک کی کمی ہے اور تمام تر کوششوں کے باجود ہم صحت کے حوالے سے تمام اشاروں (انڈیکیٹرز) میں پیچھے ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی 36 فیصد عورتیں اور بچے آیوڈین کی کمی کا شکار ہیں جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کو متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر نصیر نے تجویز پیش کی کہ نمکیات کی کمی پر قابو پانے کے لیے بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے عوام کو اضافی غذائیت کا حامل (فورٹیفائڈ) آٹا فراہم کرنا چاہیے۔ اس موقع پر نیوٹریشن سول سوسائٹی الائنس پاکستان کے ڈاکٹر ارشاد دانش کا کہنا تھا پاکستان میں غذائیت پر سرمایہ کاری کی صورتحال بدترین ہے اور اس حوالے سے ہمارا شمار سب صحارا افریقی ممالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ ورکشاپ میں سماجی کارکن توصیف حیدر نے کہا کہ غذائیت کے شعبے میں ایک ڈالر کی سرمایہ کاری سے 16 ڈالر کمائے جاسکتے ہیں کیونکہ صحت مند عوام مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ (ڈان، 1 دسمبر، صفحہ 4)

رخ زمانہ.....

بھارت میں بھوک کا بحران سنگین

انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (International Food Policy Research Institute /IFPRI) کی جاری کردہ رپورٹ گلوبل ہنگر انڈیکس (Global Hunger Index /GHI) کے مطابق دیگر جنوبی ایشیائی ممالک کی نسبت بھارت میں بھوک کا مسئلہ انتہائی گھمبیر ہے۔ بھارت کے 15.2 فیصد شہری غذائی کمی کے شکار ہیں اور پانچ سال سے کم عمر 38.7 فیصد بچے نشو ونما میں کمی کے شکار ہیں۔ سال 2016 کے عالمی درجات میں بھارت ترقی پزیر 188 ممالک میں سوائے پاکستان کے جو 107 درجے پر ہے سب سے پیچھے 97 نمبر پر ہے۔ چین 29، نیپال 72، میانمار 75، سری لنکا 84 اور بنگلہ دیش 90 نمبر پر ہے۔ بھارت میں GHI (جی ایچ آئی) اسکور 28.5 ترقی پزیر ممالک کی اوسط جی ایچ آئی اسکور 21.3 کے مقابلے میں بدترین ہے۔ مثلا برازیل اور ارجنٹائن میں جی ایچ آئی اسکور پانچ سے کم ہے جو ترقی پزیر ممالک میں سب سے بہتر اسکور ہے۔ رپورٹ کے مطابق اگر غربت میں کمی کی شرح یہی رہی جو 1992 سے چلی آرہی ہے تو 45 سے زیادہ ممالک بشمول بھارت، پاکستان، ہیٹی، یمن اور افغانستان میں غربت میں کمی کے جی ایچ آئی اسکور تشویشناک ہی رہیں گے جو 2030 تک بھوک کے

خاتمے کے ہدف سے بہت دور ہے۔ تاہم 20 ممالک بشمول روانڈا، کمبوڈیا اور میانمار نے 2000 سے اب تک اپنے جی ایچ آئی اسکور میں 50 فیصد کمی کی ہے جبکہ اسی عرصے میں بھارت میں 25.4 فیصد کمی ہوئی ہے۔ اب تک دستیاب اعداد و شمار کے مطابق کوئی بھی ترقی پزیر ملک ''انتہائی تشویشناک صورتحال'' والے درجہ میں نہیں ہے۔ جی ایچ آئی اسکور چار اشاروں پر مبنی بھوک ناپنے کے لیے ایک طریقہ کار ہے جس میں آبادی میں غذائی کمی، بچوں کی اموات، بچوں میں مستقل پائی جانے والی غذائی کمی، (یعنی اسٹنٹنگ اور ویسٹنگ) شامل ہیں۔ 10 یا اس سے کم اسکور کا مطلب کم بھوک جبکہ 50 سے زیادہ اسکور کا مطلب بھوک کے حوالے سے انتہائی تشویشناک صورتحال ہوتا ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 12 اکتوبر، صفحہ 16)

مستقبل میں غذائی تحفظ کی صورتحال: ایف اے او

اقوام متحدہ کی خوراک و زراعت کی عالمی تنظیم (Food and Agriculture Organisation/FAO) کی 2016 کی جاری کردہ رپورٹ میں دعوی کیا گیا ہے کہ سب صحارا افریقہ، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں غریبوں، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو روزگار کے لیے زراعت پر انحصار کرتے ہیں میں غذائی تحفظ کی صورتحال بدتر ہوسکتی ہے اگر اس حوالے سے فوری اقدامات نہ کیے گئے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ زراعت اور زرعی نظام کی دوبارہ سے تعمیر پیچیدہ مسئلہ ہے کیونکہ اس میں مختلف حصہ دار، کئی طرز کی کھیتی باڑی، غذا تیار کرنے کے طریقہ کار اور ماحولیاتی نظام پائے جاتے ہیں۔

ترقی پزیر ممالک میں جہاں تقریبا 500 ملین چھوٹے کاشتکار گھرانے مختلف ماحولیاتی اور سماجی و معاشی حالات میں خوراک اور دیگر زرعی پیداوار کرتے ہیں، ان سب کے حالات مختلف ہیں اس لیے ان کے مسائل کا حل بھی ان کے حالات پر مبنی اور موزوں ہونا چاہیے۔ موسمی تبدیلی سے مطابقت رکھنے والی فصلوں کے حوالے سے بھی رپورٹ میں وضاحت پیش کی گئی ہے جیسے کہ نائٹروجن سے بھرپور اور گرمی برداشت کرنے والی فصلوں کی اقسام، زمین کی تیاری کے بغیر اور زمین کی رخیزی سے متعلق انتظامات کے ذریعے پیداوار اور کسان کی آمدنی میں اضافہ شامل ہے۔ رپورٹ میں زرعی شعبے سے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کرنے کے لیے طریقہ کار کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ جیسے چاول کی فصل میں پانی بچانے کے متبادل طریقے 45 فیصد جبکہ مال مویشی شعبہ میں مزید موثر طریقے استعمال کرکے میتھین گیس کے اخراج میں 41 فیصد کمی کی جاسکتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق عالمی غربت کم کرنے اور غذائی تحفظ کے لیے چھوٹے کسانوں کو موسمی تبدیلی سے ہم آہنگ کرنا انتہائی اہم ہے اور اس حوالے سے رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ FAO (ایف اے او) نے پالیسی سازوں پر زور دیا ہے کہ وہ ان رکاوٹوں کی نشاندہی کرکے انہیں دور کریں جن میں مداخل پر دی جانے والی زرتلافی بھی شامل ہے جو غیر پائیدار زرعی طریقوں کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ نامناسب مراعات، منڈی تک ناکافی رسائی، اور سماجی تحفظ کے منصوبوں تک عدم رسائی چھوٹے کسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں خصوصاً عورتوں کو جو زرعی افرادی قوت کا 43 فیصد ہیں۔ (ڈان، 18 اکتوبر، صفحہ 5)

بائیر کا یورپ میں جینیاتی فصلیں متعارف نہ کروانے کا وعدہ

جرمنی کی کیمیائی کمپنی بائیر نے کہا ہے کہ وہ بیج اور زرعی زہر بنانے والی کمپنی مونسانٹو خریدنے کے بعد یورپ میں جینیاتی فصلیں متعارف نہیں کروائے گی۔ کمپنی کے سربراہ ورنر باؤمین (Werner Baumann) نے کہا ہے کہ بائیر مونسانٹو کو یورپ میں جینیاتی فصلیں اگانے کے لیے نہیں خرید رہی۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں یہ مونسانٹو کی نسبت بائیر کے لیے آسان ہوگا لیکن کمپنی کا ایسا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ اگر یورپی سیاست اور عوام جینیاتی بیج نہیں چاہتے تو کمپنی کو ان کا فیصلہ قبول ہے چاہے کمپنی اس پر اختلاف ہی کیوں نہ رکھتی ہو۔ بائیر کا ستمبر میں 65.7 بلین ڈالر میں امریکی کمپنی مونسانٹو خریدنے کا فیصلہ کسی جرمن کمپنی کے لیے اب تک کا سب سے بڑا سودا ہے اور کافی متنازعہ بھی، کیونکہ مونسانٹو کے جینیاتی بیج کی ساخت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ مونسانٹو کا ہی زرعی زہر گلائی فوسیٹ (glyphosate) استعمال ہوتا ہے جو اس سال سرطان کے خطرات کی وجہ سے خبر کی سرخیوں میں واضح رہا ہے۔ ماحولیاتی گروہ اور سیاستدان اور کسانوں نے دونوں کمپنیوں کے اس انضمام کو روکنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 23 اکتوبر، صفحہ 15)

فرانس کے سرمایہ کار بلوچستان میں سرمایہ کاری کے خواہش مند

پاکستان میں فرانس کی سفیر مارٹن ڈورنس نے کہا ہے کہ بلوچستان میں معدنیات، زراعت اور ماہی گیری شعبے میں بہت مواقع ہیں اور صوبے میں امن و تحفظ کی بہتر صورتحال فرانسیسی سرمایہ کاروں کے لیے پرکشش ہوگی۔ دورہ بلوچستان کے دوران سفیر نے کوئٹہ چیمبر آف اسمال ٹریڈرز اینڈ اسمال انڈسٹری کے عہدے داروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ فرانس کی 40 کمپنیاں پاکستان میں تین بلین ڈالر کی سرمایہ کاری سے مختلف شعبہ جات میں کام کررہی ہیں جبکہ بلوچستان کے اوچ بجلی گھر میں بھی 1.1 بلین ڈالر سرمایہ کاری کی جاچکی ہے۔ فرانس کی کمپنیاں توانائی، صاف پانی، آمدورفت اور دیگر شعبہ جات میں سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ فرانس کا امدادی ادارہ فرنچ ڈیولپمنٹ ایجنسی سبز توانائی سے متعلق منصوبوں کے لیے وسائل فراہم کررہا ہے۔ (ڈان، 15 دسمبر، صفحہ 10)

ترمیمی سیڈ ایکٹ 2015 کے خلاف درخواست کی سماعت

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ سیڈ ایکٹ 2015 کے خلاف دائر کردہ درخواست کی سماعت کرینگے جس میں کہا گیا ہے کہ بیج کا ترمیمی قانون کسانوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور یہ قانون امریکہ کی بین الاقوامی بیج کمپنیوں کے کہنے پر بنایا گیا ہے۔ درخواست گزار ایڈوکیٹ شیراز زکاء کا کہنا ہے کہ یہ قانون نہ صرف زرعی اشیا کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ بنے گا بلکہ غذائی تحفظ کے لیے بھی خطرہ ہوگا۔ یہ قانون لاکھوں چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے ساتھ ناانصافی ہے جس میں کسان پر بیج محفوظ کرنے، فروخت کرنے اور تبادلہ کرنے پر جرمانہ اور قید کی سزا ہوگی جو کسانوں کی صدیوں پرانی روایت ہے۔ یہ قانون کسانوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ بیج کسی لائسنس یافتہ کمپنی یا اس کے نمائندے سے خریدیں اور یہ بیج کسان کو ہر سال خریدنا ہوگا۔ اس قانون سے زراعت پر کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہوگی اور کسان بین الاقوامی کمپنیوں کا محتاج ہوجائے گا۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ بی ٹی کپاس جیسی جینیاتی فصلیں ملک کے لیے تباہ کن رہی ہیں اس کے باوجود حکومت کا اس قانون کے ذریعے جینیاتی فصلوں کو فروغ دینا بدقسمتی ہے حالانکہ کئی یورپی ممالک نے جینیاتی فصلوں پر اس کے ماحول پر پڑنے والے انتہائی خطرناک اثرات کی وجہ سے پابندی عائد کررکھی ہے۔ (ڈان، 18 دسمبر، صفحہ 2)

2016 ممکنہ طور پر تاریخ کا گرم ترین سال

امریکی حکومتی سائنسدانوں کی جانب سے ماہانہ جاری ہونے والی عالمی موسمیاتی رپورٹ میں مزید شواہد پیش کیے گئے ہیں جن کی بنیاد پر امکان ہے کہ سال 2016 جدید تاریخ کا گرم ترین سال ہوگا کیونکہ دونوں قطب پر برف میں ریکارڈ کمی ہوئی ہے۔ تیل کے مسلسل استعمال سے مضر گیسوں کا اخراج ہورہا ہے جس سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ سال کے ابتدائی چھ ماہ میں ایل نینو کے موسمی اثرات سے خط استوا پر بحرالکاہل میں گرمی میں اضافہ ہوا ہے۔ 1880 سے اب تک رواں سال کا ماہ نومبر اب تک کا گرم ترین نومبر تھا جبکہ اس سال کے ابتدائی 11 ماہ بھی معمول سے ہٹ کر گرم رہے ہیں۔ اس سال اب تک زمینی اور سمندری سطح کا درجہ حرارت بیسوی صدی کے اوسط درجہ حرارت 57.2 ڈگری فارن ہائٹ سے 1.69 ڈگری فارن ہائٹ اوپر ہے جو 1880 سے 2016 کے درمیان جنوری تا نومبر اب تک کا سب زیادہ ریکارڈ کیا جانے والا درجہ حرارت ہے یہاں تک کہ دسمبر کے حتمی اعداد و شمار کے بغیر ہی رپورٹ میں ممکنہ طور پر رواں سال کو تاریخ کا گرم ترین سال بتایا گیا ہے۔ 1979 سے اب تک جمع کیے جانے والے اعداد و شمار کے مطابق حدت میں اضافے کے باعث قطب شمالی میں برف سکڑ کر کم ترین حجم پر آ گئی ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 26 دسمبر، صفحہ 13)

تبصرہ

اوپر دی گئی تمام خبروں سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ دیگر ترقی پزیر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مزدور، کسانوں، مزارعوں، عورتوں، ماہی گیروں اور دیگر کمزور ترین طبقات کے لیے حکمران ٹولے کے دل میں ذرہ برابر بھی رحم نہیں۔ ایک طرف زراعت سے وابستہ چھوٹے اور بے زمین کسان کو روزگار کے لالے پڑے ہیں دوسری طرف جب بھی کوئی قانون سازی ہوتی ہے تو اس میں مظلوم ترین طبقے کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے جیسے کہ سندھ کی کپاس چننے والی زرعی مزدور عورتوں کے ساتھ کیا گیا۔

المیہ یہ ہے کہ وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق نے دیہی آبادیوں کو مستحکم کرنے کے لیے پائیدار زراعت کے فروغ کے لیے بجٹ میں رقم کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ مواصلاتی سیاروں کے ذریعہ فصلوں کی نگرانی، بیج کی تصدیق کے لیے اداروں اور آبی انتظام جیسے شعبوں کے لیے بیش بہا رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ یہی صورتحال پنجاب کے پیش کردہ بجٹ کی ہے جس میں کھاد کی صنعت کو مراعات دینے کے لیے بیش بہا خطیر رقم کی گئی ہے مگر کسانوں کی بہبود کے لیے رقم ناپید ہے۔

موجودہ حکومت عالمی سرمایہ دار کو خوش کرنے کے لیے پیش پیش ہے۔ 2015 میں ہی بیج کا ترمیمی بل منظور کیا گیا تھا اور اب پلانٹ بریڈر رائٹس بل کی بھی کابینہ کمیٹی سے منظوری ہوگئی ہے۔ موجودہ حکمران ٹولہ اپنی مدت حکمرانی ختم ہونے سے پہلے بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے لیے راستے ہموار کرنے کے درپر ہے اور لگتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔ اب نتیجے میں عوام ان کمپنیوں کے محتاج ہوں یا مزید غذائی کمی اور غربت کا شکار ان حکمرانوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت کی تمام تر پالیسیاں ملک میں سرمایہ دار کمپنیوں کے کاروبار اور وسائل میں اضافے کی بنیاد پر ترتیب دی جارہی ہیں۔ چاہے بیج پر قبضہ ہو یا کھاد پر زرتلافی، تھر میں توانائی کے منصوبے ہوں یا بلوچستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے دعوے، تمام تر نام نہاد ترقی کے دعوے، عورتوں اور بچوں میں غذائی کمی کے اعداد و شمار غلط ثابت کرنے کے لیے ہی کافی ہیں۔ بچے کیوں نہ غذائی کمی اور موت کا شکار ہوں کیونکہ جس ملک میں نام نہاد اضافی گندم کو ملک سے باہر بیچنے کے لیے پرکشش رقم کی پیشکش تو کی جاتی ہے مگر تھر کے بھوکے بچوں اور ملک میں غذائی کمی کے شکار لوگوں میں بانٹنے کا سوچا بھی نہیں جاتا۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو